

عائلی کیش لائوٹ

ویکٹوریہ

مولانا احمدی

جملہ حقوق دہائی بحق ناشران محفوظ ہیں

ناشر

ملک غلام رسول ملک برادر ماجران کتب

کارخانہ بازار لاکل پور پاکستان

مطبع

استقلال پریس - لاہور

قیمت

قسم اول ————— تین روپیہ

قسم دوم ————— دو روپے ۲۵ نئے پیسے

فہرس

صفحہ

(۸) کمیشن کی سفارشات

نکاح کی رجسٹری

شادی کی عمر

عورت کے لیے مساوی حق طلاق

ایک مجلس کی تین طوائفیں

طلاق کی رجسٹری

مطلقہ کی کفالت

تعدد ازدواج پر پابندیاں

مہر

حضانہ

بہوی کے لیے مشروط بہرہ

یتیم پوتے کی وراثت

(۹) حبس مشورے

علاقہ کی خدمت میں

ارباب اقتدار کی خدمت میں

علاقہ ثلاثہ

تعدد ازدواج

یتیموں کا سسٹم

خواتین کی خدمت میں

(۱) دیباچہ

(۲) تمہید

(۳) پیش نظر مقصد اور کمیشن

(۴) کمیشن کی حیثیت دستور کی روشنی میں

(۵) ارکان کمیشن کے چند نظریات

قرآن حکیم کے متعلق کمیشن کا تصور

سنت کے متعلق ارکان کمیشن کا نظریہ

فقہ اسلامی کے متعلق کمیشن کا نظریہ

(۶) اجتہاد کی نئی تعریف

اجتہاد کی تعریف اور اس کے شرائط

(۷) اجتہاد کے نئے اصول

معاشرتی انصاف اور حکومت

الگ الگ دور الگ الگ احکام

جو قطعی اور غیر مشروط طور پر ممنوع نہیں ہو جائے

جدید اسوہ حسنہ کی پیروی کی دعوت

نئی سنت اور نئی فقہ کی ضرورت

اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت

عہد طفولیت کے احکام کی ترمیم و اصلاح

استحسان

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

دیباچہ

میں نے اپنی اس کتاب میں اس عالمی کمیشن کی رپورٹ پر مفصل تبصرہ کیا ہے جو پاکستان کی مرکزی حکومت نے ۱۹۵۵ء میں مسلمانوں کے عالمی مسائل و قوانین کا جائزہ لینے اودان کے بارے میں تجاویز و سفارشات پیش کرنے کے لیے قائم کیا تھا۔ اس کمیشن نے اپنی رپورٹ جون ۱۹۵۶ء میں پیش کی جس سے مسلمانوں کے دینی حقوق و ادعویٰ میں سخت بیناوی پیدا ہوئی۔ اخبارات میں اس کے خلاف مضامین نکلے جلسوں میں اس کے خلاف قراردادیں پاس ہوئیں۔ مسجدوں اور مدرسوں میں اس کو خلاف شریعت قرار دیا گیا، یہاں تک کہ اسلامی ذہن رکھنے والی خواتین کے طبقہ میں بھی اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا حالانکہ بظاہر یہ رپورٹ خواتین کے حقوق کے تحفظ ہی کو پیش نظر رکھ کر مرتب کی گئی تھی۔

میں نے جب یہ رپورٹ پڑھی تو مجھے ایک پہلو سے یہ بہت کارآمد چیز معلوم ہوئی وہ پہلو اس کا یہ تھا کہ اس میں اسلام کے ازدواجی و عالمی احکام و مسائل سے متعلق ان لوگوں کا نقطہ نظر پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آگیا تھا جو مغرب کے عالمی و ازدواجی نظام سے متاثر و مرعوب تھے۔ اس کمیشن میں اکثریت جدید الغیال حضرات کی تھی اور اس

رپورٹ کی ترتیب میں بھی پیش پیش وہی لوگ تھے، اس وجہ سے انہوں نے پوری جرأت کے ساتھ اس میں وہ سب کچھ کہہ دیا تھا جو وہ اپنے نقطہ نظر کی حمایت میں کہہ سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے خیال کے مطابق اس میں غلطیوں کی بھی جمع کر دیئے تھے اور قرآن و حدیث اور فقہ سے جس حد تک وہ استدلال کر سکتے تھے اس کا زور بھی اپنے زعم کے مطابق انہوں نے اس میں پورا پورا صرف کر دیا تھا، اس طرح یہ رپورٹ مغرب زدہ طبقہ کے خیالات و نظریات کا مرقع بن گئی تھی۔ اس سے پہلے کبھی طور پر شاید ہی یہ نظریات کہیں شائع ہوئے ہوں۔ اس وجہ سے میں نے اس پر مفصل تنقید لکھنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ اہل علم و ادب کی کسوٹی پر ان نظریات کے ضعف و قوت کا امتحان کر سکیں۔

میری یہ تنقید جب اہل علم کے سامنے آئی تو انہوں نے اس کو بہت پسند کیا اور یہ اسدو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوئی۔ اس کے شائع ہونے کے بعد ہر شخص نے یہ محسوس کیا کہ یہ صرف ایک رپورٹ پر ہی تبصرہ نہیں ہے بلکہ یہ اسلام کے ازدواجی و عالمی مسائل پر ایک سیر حاصل بحث ہے جس میں ان مسائل سے متعلق تمام نئے شبہات کا بھی ازالہ کر دیا گیا ہے اور تمام پرانی بے اعتدالیوں کی بھی اصلاح کر دی گئی ہے اور اس طرح اسلام کا پورا عالمی نظام ٹھیک ٹھیک کتاب سنت کی روشنی میں، جیسا کچھ وہ ہے، بالکل منقطع ہو کر سامنے آگیا ہے۔

یہ مسئلہ اگرچہ بظاہر پرانا ہے لیکن حقیقت میں یہ اب بھی بالکل نیا ہے اس لیے ہمارے ملک میں جو لوگ مغربی طرز معاشرت کے دلاوہ ہیں ان کے سوچنے کا انداز وہی ہے جو اس رپورٹ کے مرتبین کا تھا۔ اس وجہ سے جب جب یہ مسئلہ سامنے آئے گا انہی دلائل اور معلومات کے ساتھ سامنے آئے گا جو اس رپورٹ میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا ذہن اس سلسلہ میں برہنہ کی الجھنوں سے محفوظ رہے تو اس مقصد کے لیے یہ کتاب انشاء نہایت مفید ثابت ہوگی۔

اس کو مطالعہ کرنے وقت دو باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

ایک یہ کہ یہ کتاب ۴ - ۵ سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ اس وقت کے حالات آج کے حالات سے بہت کچھ مختلف تھے۔ قدرتی طور پر جہاں جہاں کوئی بات کتاب میں ایسی آئی ہے جس پر وقت کے حالات کا کوئی پرزور ہے وہ موجودہ حالات میں اجنبی معلوم ہوگی، اس وجہ سے قارئین سے درخواست ہے کہ وہ کتاب کے مطالعہ میں فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کریں۔ اگرچہ میں نے نظر ثانی کرتے وقت کتاب میں بعض مناسب حال تبدیلیاں کر دی ہیں لیکن ہر صاحبِ قلم اس بات کو جانتا ہے کہ اس طرح کی کسی اصلاح سے کسی کتاب کو اس ماحول کے اثرات سے بالکل الگ نہیں کیا جاسکتا جس میں وہ لکھی گئی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں جگہ جگہ اس رپورٹ کے مرتبین بھی قدرتی طور پر زیر بحث آئے ہیں درآنحالیکہ اب ان میں سے بعض اس دنیا میں موجود نہیں رہے ہیں۔ ان کے بارے میں جو فقرے زبانِ قلم سے نکل گئے ہیں اب ان کے لیے کوئی موقع و محل باقی نہیں رہا ہے۔ انشاء تعالیٰ ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو بھی معاف کرے اور ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے بھی درگزر فرمائے۔ ناظرین سے التجا ہے کہ اس طرح کے فقروں کو نظر انداز کرتے ہوئے کتاب کا مطالعہ کریں۔

آخر میں دعا ہے کہ انشاء تعالیٰ اس کتاب کو معاشرتی فتنوں کے سد باب کا ذریعہ بنائے اور ذہنی الجھنیں دور کرنے میں اس سے اہل حق کو مدد ملے اور اگر کوئی بات

اس میں میرے قلم سے حق کے خلاف نکلے ہے تو اس کے شر سے بچنے کو اور تمام اہل ایمان کو محفوظ رکھے۔

امین احسن اصلاحی

۲۵ اگست ۱۹۶۰ء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تہنید

اگست ۱۹۵۵ء میں بھاری مرکزی حکومت نے سات افراد پر مشتمل ایک کمیشن بٹھایا تھا جس کے ذمہ یہ کام سپرد کیا گیا تھا کہ وہ نکاح و طلاق اور کفالت وغیرہ سے متعلق موجودہ قوانین کا جائزہ لے کر بتائے کہ کیا عورت کو معاشرہ میں اس کی اصلی جگہ دلانے کے لیے ان قوانین میں کسی ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے، نیز وہ نکاح و طلاق کی رجسٹری، طلاق بذریعہ عدالت اور ازدواجی امور سے متعلق خاص عدالتوں کے قیام کے متعلق بھی اپنی راپوں کا اظہار کرے۔ اس کمیشن کے صدر خلیفہ شجاع الدین مرحوم بنائے گئے تھے اور ان میں مندرجہ ذیل حضرات تھے :-

- ۱۔ خلیفہ عبدالحکیم صاحب
- ۲۔ مولانا احتشام الحق صاحب
- ۳۔ مسٹر عنایت الرحمن
- ۴۔ بیگم شامہ نواز

۵۔ بیگم انورجی احمد

۶۔ بیگم شمس النہار محمود

کمیشن کے قیام کے غور سے ہی عرصہ بعد خلیفہ شجاع الدین صاحب کا انتقال ہو گیا۔
اس وجہ سے صدارت کے لیے ان کی جگہ پر میاں عبدالرشید صاحب سابل چیف جسٹس پاکستان
کا انتخاب عمل میں آیا۔

اس کمیشن نے اپنی رپورٹ مرتب کر کے حکومت کے حوالہ کر دی ہے اور حکومت کی طرف سے
یہ ۲۰ جون ۱۹۵۶ء کے سرکاری گزٹ میں شائع ہو گئی ہے۔ کمیشن کے ارکان میں سے مسٹر عاتق الرحمن
صاحب نے کمیشن کی کامدائیوں میں اگرچہ عملاً کوئی حصہ نہیں لیا لیکن اس رپورٹ کو ان کی منظوری
ساحل ہے۔ مولانا احتشام الحق صاحب نے اس پر ایک اختلافی نوٹ لکھا ہے جس میں ارکان کمیشن
کے نظریات اور ان کی سفارشات سے شدت کے ساتھ اختلاف کیا ہے۔ یہ نوٹ ایک ضمیمہ
کی صورت میں حکومت کی طرف سے علیحدہ شائع ہو چکا ہے۔ اس طرح یہ رپورٹ عملاً صاحب
کے علاوہ خلیفہ عبدالحکیم صاحب اور مذکورہ تینوں بیگمات کی ذمہ داری کا نتیجہ ہے۔
یہ رپورٹ مختلف اعتبارات سے بڑی اہمیت رکھتی ہے جن میں سے بعض کی طرف
میں یہاں اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس رپورٹ میں جو سفارشات پیش کی گئی ہیں وہ اگر منظور ہو جائیں
تو ہماری معاشرتی زندگی کا موجودہ ڈھانچہ یک قلم تبدیل ہو جائے گا۔ وہ ساری اساسات بھی
ان تبدیلی کے نتیجے میں ختم ہو جائیں گی جن پر اسلام نے ہمارے معاشرتی نظام کو قائم کیا ہے۔
وہ ساری عادات بھی راعام اس سے کہ وہ غلط ہیں یا صحیح ختم ہو جائیں گی جن کا عام طور پر
احترام کیا جاتا رہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس رپورٹ کی منظوری ہمارے معاشرہ کے کسی ایک ہی طبقہ کو
متاثر نہیں کرے گی بلکہ اس کے تبلیغ و تشریح نتائج میں سے اس ملک کا ہر شہری حصہ پائے گا،
عام اس سے کہ وہ امیر ہو یا غریب، شہری ہو یا دیہاتی، متمدن ہو یا وحشی، عورت ہو یا مرد،
نیک ہو یا بد، بلکہ سچ پوچھیے تو اس کے دور رس نتائج کی زد سے وہ چھوٹے بڑے ادارے بھی
نہ بچ سکیں گے جو آپ کے معاشرے کی مختلف ضرورتوں کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ یہاں تک
آخری نتیجے کے طور پر اس سے ہماری ریاست بھی ایک بالکل ہی مختلف ہوئی اختیار
کرے گی جو ہمارے نئے دستور نے اس کا پیش کیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس رپورٹ کے مزید لے ہمیں کچھ نئے نظریات اور نئے اصول
اجتہاد دیے ہیں جن سے ہم بالکل پہلی مرتبہ آشنا ہوئے ہیں۔ سابق ائمہ و مجتہدین سے ہمیں
جو کچھ ورثہ میں ملا ہے اس کے پورے ذخیرہ میں ہمیں ان نظریات اور ان اصولوں کا کوئی
معارضہ نہیں ملتا ہے۔ یہ اصول اگر تسلیم کر لیے جائیں (اور اس رپورٹ کے تسلیم کر لینے کے
معنی ہیں کہ ہم نے ان کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا) تو نہ صرف ہمارا وہ پورا دینی ذخیرہ
ایک ذخیرے کے معنی ہو کر رہ جاتا ہے جو بارہ تیرہ سو سال میں مرتب ہوا ہے۔ بلکہ سرے سے
قرآن وحدیث بھی ایک لایعنی شے بن کر رہ جاتے ہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ دستور کے نفاذ کے بعد یہ بالکل پہلی چیز ہمارے سامنے آئی
ہے جس سے اس اسلامی زندگی کا کچھ آئیڈیا ہوتا ہے جو ہمارے ملک کا برادران کے ہم رنگ
دعوت مشرب حضرات کے ذہنوں میں ہے۔ دستور میں یہ ضمانت جو دی گئی ہے کہ اس ملک میں
اسلامی قوانین نافذ ہوں گے، غیر اسلامی قوانین اسلامی قوانین سے بدلے جائیں گے، ایک
کمیشن بنے گا جو ان قوانین کو مرتب کرے گا اور ان کے نفاذ و اجرا کے لیے اقدامات و مراحل

تجویز کرے گا۔ یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ یہ ساری چیزیں کس شکل میں وضع ہوں گی اور یہ دیکھ کے کس صورت میں عملی جامہ پہنیں گے۔

یہ سارے پہلو اس بات کے متقاضی ہیں کہ رپورٹ کو محض سرسری نظر سے دیکھ کر اس کو آگے کے مراحل سے گزر جانے کے لیے چھوڑ نہ دیا جائے بلکہ اس کی ایک چیز کو اچھی طرح تجزیہ کر کے سمجھا جائے۔ اور اگر برقی الواقع اپنی نتائج کی حامل ہے جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے، تو اس فتنہ کے سد باب کی تدبیریں کی جائیں۔ کیونکہ یہ نتائج ہمارے ہی سامنے آنے میں کسی اور کے سامنے نہیں جانے ہیں۔

ان گونا گوں اہمیتوں کے پیش نظر میں اس رپورٹ پر مفصل تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تبصرہ چار مختلف پہلوؤں سے ہوگا۔

پہلے میں پیش نظر مقصد کے لحاظ سے اس کمیشن کی تشکیل کی نوعیت پر کچھ روشنی ڈالوں گا۔ اس کے بعد بتاؤں گا کہ ہمارے موجودہ دستور کی رو سے اس کمیشن کی حیثیت کیا ہے؟ پھر ان جدید نظریات اور اجتہاد کے ان نئے اصولوں پر تبصرہ کروں گا جو اس رپورٹ کے ذریعہ سے بالکل پہلی مرتبہ ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اس کے بعد وضاحت کے ساتھ ان سفارشات کو زیر بحث لاؤں گا جو کمیشن نے پیش کی ہیں۔ اور یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ یہ سفارشات کتاب و سنت اور حالات و مصالح سے کس حد تک مطابقت رکھتی ہیں اور اگر یہ منظور ہو جائیں تو ان سے کن نتائج کے پیدا ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

لیکن یہ بحث نامکمل رہے گی اگر اس تبصرہ کو تبصرہ ہی کی حد تک محدود رکھا جائے۔ اس تبصرہ سے یہ تو ممکن ہے کہ رپورٹ کی خامیاں اور غلطیاں سامنے آجائیں لیکن صرف

اتنے سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہمارے موجودہ عائلی نظام میں بہت سی خرابیاں گھس آئی ہیں جو ان پاکیزہ اصولوں اور ان پاکیزہ تعلیمات کے بالکل خلاف ہیں جن پر اسلام نے اپنے عائلی نظام کو قائم کیا تھا۔ اس وجہ سے اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ سفارشات اسلام کے خلاف ہیں تو ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم وہ صحیح تدابیر بھی بتائیں جن سے موجودہ خرابیوں کی اصلاح ہو سکے۔ چنانچہ میں انہی وہ تدابیر بھی بتاؤں گا جو موجودہ خرابیوں کو دور کر سکتی ہیں۔

بیش نظر مقصد اور کمیشن

اس کمیشن کے قیام کا مقصد، جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے، ہمارے موجودہ عائلی قوانین کا جائزہ لے کر یہ بتانا تھا کہ کیا عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے نقطہ نظر سے ان قوانین میں کسی ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے؟ اور اگر ضرورت ہے تو کس قسم کی اصلاح کی ضرورت ہے؟

بہر شخص جاننا ہے کہ یہ عائلی قوانین کم و بیش وہی ہیں جو انگریزوں نے محمدن لاکے نام سے اپنے زمانہ حکومت میں (غالباً ۱۷۷۲ء میں) جاری کیے تھے۔ اس ملک میں چونکہ حنفی المذہب مسلمانوں کی اکثریت تھی اس وجہ سے قدرتی طور پر یہ محمدن لافقہ حنفی ہی رہا۔ یعنی ہوا اور اس کے لیے وہی کتابیں ماخذ نہیں جو حنفیوں کے نزدیک معتبر خیال کی جاتی تھیں۔ مثلاً ہدایہ، فتاویٰ عالمگیری اور مسراجی وغیرہ خود انگریزوں ہی نے اپنے اہتمام میں ان کتابوں کے انگریزی میں ترجمے کرائے۔ پھر عدالتوں میں یہی کتابیں بحث و ثبوت اور حوالوں کے لیے مستند و معتبر تسلیم کی گئیں۔

سہ شیعہوں کے لیے غالباً کتاب شرائع الاسلام

کمیشن کے فاضل ارکان کے نزدیک یہ انگریزوں کی ایک چال تھی کہ انھوں نے مسلمانوں کو محمدن لاکے ساتھ باندھ کر رکھ دیا جس کے سبب ان کی سوسائٹی بالکل جامد ہو کر رہ گئی اور بدلتے ہوئے حالات کے قدم قدم اس کو تبدیل ہونے اور ترقی کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

رومیوں کی طرح انگریزوں نے بھی مختلف مذہبی گروہوں کے پرسنل لاء میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت مسلمانوں میں ان قوانین کو جاری کیا گیا جو انگریزوں نے لاکے نام سے موسوم ہیں۔ اسلامی قانون جس کا اجرا اس مشکل میں شروع ہوا وہ ترقی پذیر حالات اور زندگی کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کا ساتھ دینے والا ذی روح وجود نہ رہا تھا۔ مسلمانوں کے لیے پرسنل لاء کے نام سے جو چیز اختیار کی گئی تھی وہ بالکل دنیائوی جامد اور مختلف اعتبارات سے غیر واضح تھی۔ لیکن سیاسی عملی کے سبب اس کی اصلاح یا تجدید ناممکن تھی۔ گورنمنٹ آف پاکستان ص ۱۳۱

میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کمیشن کے فاضل ارکان کو انگریزوں پر کس پتہ کا غصہ ہے؟ کیا اس بات کا کہ حبیب انھوں نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کو اپنے ترقی پسندانہ قوانین ہی کے تحت کر دیا تھا تو یہ ذرا سادہ سمجھنا پڑتا کہ لاکے کیوں لگا چھوڑ دیا، اس کی جگہ پر بھی اپنے ہی ترقی پسندانہ قوانین کیوں نہ جاری کر دیئے کہ اس دنیائوی اور جامد قانون کا ہمیشہ کے لیے قصہ ہی پاک ہو جاتا؟ یا اس بات کا کہ انھوں نے ہدایہ اور عالمگیری اور مسراجی جیسی دنیائوی کتابیں کیوں عدالتوں کے ہاتھوں میں پکڑا دیں۔ کیوں نہ چند ترقی پسند بیگمات پر مشتمل ایک کمیشن بھی کراں کتابوں میں اصلاحات اور ترمیمات کرائیں؟ یا اس بات پر

ان فاضل ارکان کو غصہ ہے کہ انگریزوں نے رومیوں کی اندھا دھند تقلید میں مختلف گروہوں کے پرسنل لام کی حفاظت کی دقتا نویسی پالیسی پر کیوں عمل کیا، کیوں نہ اس فرسودہ پالیسی ہی کا خاتمہ کر دیا کہ سب ایک ہی ساتھ ڈوبتے اور ایک ہی ساتھ ترے۔

میرے نزدیک ارکان کمیشن کا یہ غصہ جس سبب سے بھی ہو بالکل بے جا ہے۔ انگریزوں سے زیادہ اس بات کا کوئی شائق نہیں تھا کہ وہ ہماری زندگی کے ہر گوشے اور ہر شعبے کو بالکل مغربی رنگ میں رنگ دیں اور اگر وہ رنگ دیتے تو اس میں شک نہیں کہ آج ہمارے اس کمیشن کا کام بڑا آسان ہو جاتا بلکہ شاید اس قسم کے کسی مقصد کے لیے کسی کمیشن کے بھٹانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی جس منزل پر پہنچنے کے آج ہم ارمان رکھتے ہیں اس پر آج سے بہت پہلے ہم پہنچ چکے ہوتے (لیکن انگریز اس ملک پر حکومت کرنا چاہتے تھے اس وجہ سے وہ بہت بھونک بھونک کر قدم رکھتے تھے وہ پرسنل لا کی نزاکتوں کو سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہم نے حسن لوگوں کا ملک چھینا ہے وہ اس صدمہ کو تو شاید کچھ عرصہ کے بعد بھول جائیں لیکن اگر ہم نے ان کے پرسنل لا کو بھی قانون کے زور سے بدنام کیا تو پھر یہ ہم کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔

پرسنل لا کسی قوم کی آخری مناع ہوتی ہے جس کے ٹٹ جانے کے بعد وہ قوم بالکل ہی بے پایاں ہو جاتی ہے۔ سب کچھ کھود دینے کے بعد بھی اگر کسی قوم کا پرسنل لا باقی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قوم کا شخص ابھی باقی ہے اور حجب تک شخص کسی نہ کسی حد تک باقی ہے تو گویا اس کی ہستی بھی قائم ہے لیکن اگر یہ بھی باقی نہ رہا تو گویا اس کی ہستی ہی سرے سے ختم ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم اپنے پرسنل لا کی حفاظت کے لیے اپنا آخری زور لگا دیتی ہے اور یہاں اوقات اس کے لیے سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ اسی حقیقت کا پیش نظر رکھ کر معزور سے معزور فالتوں اور مستبد سے مستبد حکمرانوں نے بھی اپنی رعایا کے پرسنل لا کا احترام کیا ہے۔ رومیوں نے اگر احترام کیا تو

اس کی وجہ، جبکہ اس فاضل ارکان نے سمجھی ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے محکوموں کے معاشرے کو جامد دیکھنا پسند کرتے تھے اور اگر انگریزوں نے ہمارے پرسنل لا کا احترام کیا تو اس کی وجہ بھی یہ نہیں تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ ہم بدایہ اور عالمگیری ہی کے چکر میں رہیں، ان سے باہر نہ نکل سکیں بلکہ اس کی وجہ دی ہے جو عرض کی گئی ہے۔ انگریز اس رمز سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ اپنے پرسنل لا کے ساتھ مسلمانوں کی وابستگی مذہبی بھی ہے اور جذباتی بھی۔ وہ اس کو چھڑ کر کوئی فائدہ تو اٹھانہ سکیں گے البتہ اپنے اقتدار کے لیے جس کی جڑیں ابھی مستحکم نہیں ہوئی تھیں، ایک بہت بڑا خطرہ مول لیں گے۔

عبارت میں جہاں مسلمانوں کو جان و مال کا تحفظ بھی حاصل نہیں ہے، دستور کی حد تک ہی رہی، ان کا پرسنل لا محفوظ ہے۔ خود ہم نے اپنے دستور میں پاکستان کے اندر اپنے والی اقلیتوں کے پرسنل لا کے تحفظ کی ضمانت دی ہے۔ کیا یہ ضمانت ہم نے اس خیال سے دی ہے کہ ان کا معاشرہ جامد رہے اور وہ تجدید کی منزلیں طے نہ کر سکیں یا اس لیے دی ہے کہ آج ہر نظام میں خواہ دینی ہو یا لادینی پرسنل لا کے احترام کو اس وجہ سے ضروری قرار دے دیا گیا ہے کہ لوگوں کے احساسات اس کے بائیں میں نہایت نازک ہوتے ہیں اور اس میں کسی مداخلت کو لوگ ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرتے۔

ارکان کمیشن کا یہ خیال بھی بالکل غلط ہے کہ انگریزوں نے پرسنل لا کے نام سے جو چیز اختیار کی وہ دقتا نویسی، فرسودہ اور جامد تھی۔ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ محمدن لا کی بنیاد بدایہ، عالمگیری اور معاملات میراث میں سرحدی پر ہے۔ یہ اسلامی قانون کی وہ کتابیں ہیں جو اس حکومت میں نقصا اور فتویٰ کی بنیاد رہ چکی تھیں جس کی جگہ انگریزوں نے فی حقیقت اس وجہ سے قدرتی طور پر حجب انگریزوں نے پرسنل لا کی حد تک اسلامی قوانین کو باقی رکھنا چاہا تو وہ انہی

کتابوں پر اعتماد کرنے پر مجبور ہوئے جن پر مسلمانوں کو پہلے سے اعتماد تھا۔

ان کتابوں کو آج آپ جو چاہیں گالیاں دے لیں، کوئی آپ کی زبان نہیں پکڑ سکتا۔ لیکن جس زمانہ میں انگریزوں نے ان کتابوں کو محمدؐ ن لاکی اس کی حیثیت سے اختیار کیا تھا اس زمانے میں کوئی شخص ان کی نسبت وہ الفاظ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا جو آج کہے جا رہے ہیں۔

بدایہ فقہ حنفی کی اہمیت میں شمار ہوتی ہے اور اسلامی قانون کا کوئی طالب علم اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ کمیشن کے ارکان کی نسبت تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس سے واقف ہیں یا نہیں لیکن کمیشن کے فاضل صدر کی نسبت میں یہ گمان رکھتا ہوں کہ وہ کم از کم مہلٹن کے ترجمہ کے واسطے ہی اس سے واقف ہوں گے اور اس کے بارے میں مہلٹن کی رائے سے بھی بے خبر نہیں ہوں گے۔ ہماری قوم میں جسٹس محمود جس پایہ کے قانون دان گذرے ہیں اس پایہ کا کوئی دوسرا قانون دان نہ گذرا اور نہ آج بدست سے کوئی موجود ہے، انھوں نے اس کتاب کی نسبت جو خیالات ظاہر کیے ہیں وہ بھی پاکستان کے سابق چیف جسٹس سے مخفی نہیں ہو سکتے۔

فوائد عالمگیری کا حال یہ ہے کہ وہ کسی ایک شخص کی تصنیف نہیں ہے بلکہ گیارہویں صدی ہجری میں اس کو مرتب کرنے کے لیے سلطان محمد اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے پورے ملک کے مشہور و مستند علماء کا ایک بورڈ قائم کیا تھا اور اس بورڈ نے یہ مقصد پیش نظر رکھ کر اس کو مرتب کیا تھا کہ یہ منسلب سلطنت کی عدالتوں کے لیے ایک مدون ضابطہ کی حیثیت سے کام دے۔ اگرچہ پیش نظر مقصد کے لحاظ سے یہ کتاب نئے اسلوب پر تو مدون نہ ہو سکی، تاہم یہ برابر فقہ حنفی کے ایک معتبر ترین مجموعے کی حیثیت سے حکام اور فقہاء دونوں کا مرجع رہی ہے۔

بھی حال سراجی کا ہے۔ کم از کم میراث کے مسائل میں اس سے زیادہ مرتبہ، معتبر اور مستند کتاب آج بھی کوئی موجود نہیں ہے۔ بہر حال انگریزوں نے جو محمدؐ ن لا باری کیا اس کی بنیاد اسی کتابوں پر تھی اور یہ کتابیں فقہ حنفی کی نہایت معتبر و مستند کتابیں ہیں۔

مجھے اس امر سے انکار نہیں ہے کہ انگریزوں نے جو محمدؐ ن لا جاری کیا وہ بعض اعتبارات سے ناقص تھا اور جن کتابوں سے انہوں نے مواد پر یہ مبنی تھا وہ کتابیں بھی جانچنے پر کھنے کی محتاج تھیں۔ بہت ہی اچھا ہونا اگر پہلے ہی کتاب اور سنت کی کسوٹی پر محمدؐ ن لا کو پرکھنے اور اس کے صحیح و سقیم میں امتیاز کرنے کی کوشش کی گئی ہوتی۔ اور اگر پہلے یہ کوشش نہیں کی گئی تو اب تو نہایت ضروری ہے کہ اس بارے میں محمدؐ ن لا کو از سر نو جانچ کر اس کو براہ راست کتاب و سنت کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ اس میں تغیر اور اصلاح کی ضرورت کے کسی کو انکار نہیں ہے۔ اگرچہ گھر سے تو اس بات پر ہے کہ اس کام کے لیے جو کمیشن بٹھایا گیا وہ اس اہم اور نازک کام کے لیے کسی طرح بھی موزوں نہیں تھا۔ یہاں پیش نظر کام یہ نہیں تھا کہ انگریزوں نے محمدؐ ن لا کے نام سے ہمارے عائلی نظام کے لیے کچھ ضابطے جاری کر رکھے تھے جو فرسودہ اور کہنہ ہو چکے تھے جن سے ہماری سوسائٹی کی ترقی رکی ہوئی تھی، ان کو موجودہ زمانے کے ترقی یافتہ قوانین سے بدلتا ہے۔ اگر پیش نظر مقصد یہ ہوتا تو اس مقصد کے لیے یہ کمیشن بڑا نہیں تھا۔ ہم اس کی تشکیل پر کوئی اعتراض نہ کرتے لیکن یہاں تو جیسا کہ عرض کیا گیا، درحقیقت فقہ حنفی پر نقد و نظر اور اس میں اصلاحات تجویز کرنے کا کام کمیشن کے سپرد کیا گیا تھا۔ بدایہ، عالمگیری اور سراجی کی غلطیوں کی اس کو اصلاح کرنی تھی بلکہ صحیح معنوں میں پوری فقہ اسلامی کے بہت سے مسلمات اصلاح و ترمیم کے لیے اس کے حوالے کر دیئے گئے تھے۔ یہ کام ہر شخص محسوس کر سکتا ہے، کہ

ہر کس دنیا کس کے کرنے کا نہیں ہے۔ اسی کو اگر کر سکتے ہیں تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کتاب و سنت سے براہِ راست گہری واقفیت رکھتے ہوں۔ جو احکام اسلامی کی حکمتوں اور مصلحتوں سے باخبر ہوں، جو اجتہاد اور قیاس کے اصولوں کا علم رکھتے اور ان کا استعمال جانتے ہوں جو فہمِ شریعت میں اتنا دہک رکھتے ہوں کہ کسی اجتہاد یا قیاس کو، بالخصوص جب کہ وہ امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل جیسے جلیل القدر ائمہ کا ہو، براہِ راست کتابِ سنت کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کا سقم و اضع کر سکتے ہوں اور ساتھ ہی خود اپنے اجتہاد کے وزن کو دلائل سے واضح کر سکتے ہوں۔ کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اس پورے کمیشن میں ایک شخص بھی ایسا ہے جو ان کاموں کا اہل ہے، ان کاموں کا اہل ہونا تو دور کی بات ہے، کیا ان میں سے کسی صاحب نے ہدایہ، عالمگیری اور مسراجی کا مطالعہ بھی کیا ہے؟ براہِ راست مطالعہ نہ ہی کیا ان کتابوں کے وہ انگریزی ترجمے ہی کسی نے پڑھنے کی سعادت حاصل کی ہے جو مہلثین، سر دہیم جنرل اور باغی نے کیے ہیں؟ کیا ان میں سے کسی صاحب یا صاحبہ نے قرآن پر حدیث پر فقہ اسلامی پر کوئی چھوٹا یا بڑا کام کیا ہے؟ کوئی ریسرچ کی ہے؟ کوئی تصنیف فرمائی ہے؟ کوئی قابل ذکر مقالہ لکھا ہے؟ اگر ان میں سے ہر سوال کا جواب نفی میں ہے اور ایمانِ داؤا جواب ان کا نفی ہی میں ہو سکتا ہے تو سوچنے کی بات ہے کہ آج اسلامی شریعت اور اسلامی فقہ سے بھی زیادہ دنیا میں کوئی سائنس مظلوم ہو سکتی ہے جس میں اصلاح و ترمیم کے لیے وہ حضرات قلم اٹھاتے ہیں جو اس کی ایجاد سے بھی نا آشنا ہیں۔

کمیشن کی حیثیت دستور کی روشنی میں

اب اس کمیشن کی حیثیت پر اپنے موجودہ دستور کی روشنی میں غور کیجیے۔

یہ کمیشن حکومت پاکستان کے ایک اعلانِ مجریہ ہم اگست ۱۹۵۷ء کی رو سے قائم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہمارے ملک میں بہت اہم تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ ۳ مارچ ۱۹۷۳ء سے ہمارا نیا دستور نافذ العمل ہے۔ اس دستور کے نفاذ کے بعد وہ ساری چیزیں آپسے آپ کا عدم ہو گئیں جو اس دستور کے منافی ہیں۔ دستور کے مطالعہ کے بعد میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ ۲۳ مارچ ۱۹۷۳ء کے بعد سے اس کمیشن کی کوئی قانونی اور آئینی حیثیت باقی نہیں رہی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دستور کی دفعہ ۹۸ میں جو ضمانت دی گئی ہے کہ کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا اور یہ کہ موجودہ قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق کیا جائے گا، اس کے متعلق ایک خاص شکل بھی متعین کر دی گئی ہے کہ اس دفعہ کے مقصد کو عمل جامہ صرف اس طریقہ سے پہنایا جائے گا جو دفعہ مذکور کی ذیلی دفعہ ۳ میں تجویز کیا گیا ہے۔ یہ ذیلی دفعہ ۳ یہ ہے۔

”یوم دستور سے ایک سال کے اندر اندر صدر ریاست ایک کمیشن مقرر کرے گا۔“

(الف) جو سفارشات پیش کرے گا کہ:-

۱۱۔ موجودہ قوانین کو اسلام کے احکام کے مطابق بنانے کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں اور

(۲) ان اقدامات کو عمل شکل دینے کے لیے کیا مدارج ہوں۔ اور

(ب) ان احکام اسلام کو جن کو قانونی شکل دی جاسکتی ہے۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی رہنمائی کے لیے موزوں شکل میں مرتب کرے گا۔

کمیشن اپنی آخری رپورٹ اپنے تقریر سے پانچ سال کے اندر اندر پیش کرے گا۔ کوئی عارضی رپورٹ وہ اس سے پہلے بھی پیش کر سکتا ہے۔ یہ رپورٹ خواہ عارضی ہو یا آخری، وصولی سے چھ ماہ کے اندر اندر پیش اسمبلی کے سامنے پیش کر دی جائے گی۔ اوریشنل اسمبلی اس پر غور کرنے کے بعد قوانین بنائے گی؟

اس دفعہ کے آخر میں تشریح کے طور پر یہ بات بھی شامل کر دی گئی ہے کہ کسی مسلم فرقہ کے پرسنل لا پراس دفعہ کو منطبق کرتے وقت کتاب و سنت کے الفاظ سے ان کی وہی تعبیریں ملا ہوں گی جو منسلقہ فرقہ کے لوگ پیش کرتے ہوں۔

اب اس دفعہ کے تمام تضامات سامنے لائیے تو چند باتیں نہایت واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

(۱) یہ کہ اسلامی احکام کو قانون کی شکل دینے اور موجودہ قوانین کو احکام اسلام کے مطابق کرنے کی اس دستور کے نفاذ کے بعد صرف ایک ہی شکل ہے جو اختیار کی جاسکتی ہے اور وہ وہی ہے جو دفعہ ۱۹۸ کی ذیلی دفعہ میں بیان کی گئی ہے۔ دستور کے الفاظ (ONLY 1.V)

(MANNER PROVIDED IN CLAUSE 3)

اس معاملہ میں نہایت واضح طور پر حصر کرنے والے ہیں۔

(۲) صدر ریاست کے مقرر کیے ہوئے کمیشن کے سوا کوئی دوسرا کمیشن مذکورہ کام کے لیے

بالکل آئین کے خلاف ہے۔

(۳) صدر ریاست کے مقرر کیے ہوئے کمیشن کا کام موجودہ قوانین کو احکام اسلام کے مطابق کرنے کے سلسلہ میں نڈا سیر تیان، مدارج تجویز کرنا اور مجالس قانون سازی کے رہنمائی کے لیے قانون سازی کے لائق احکام کو موزوں شکل میں ترتیب دے دینا ہے۔

(۴) پرسنل لا کے حد تک ہر مسلم فرقہ سے متعلق کتاب و سنت کی وہی تعبیریں معتبر ہوں گی جو اس فرقہ کے لوگ پیش کرتے ہوں، کوئی دوسری تعبیر ان کے سر نہیں منڈھی جائے گی۔ اب اس عائلی کمیشن کی حیثیت پر غور فرمائیے۔

(۱) یہ کمیشن دستور کی دفعہ ۱۹۸ کی ذیلی دفعہ ۳ کے تحت صدر ریاست کا مقرر کردہ نہیں ہے۔ یہ کمیشن دستور کے نفاذ سے پہلے حکومت پاکستان نے مقرر کیا تھا۔

(۲) اس کمیشن کے حدود کار (TERMS OF REFERENCE) اس کمیشن کے حدود کار (TERMS OF REFERENCE) سے مختلف ہیں جو صدر ریاست کے مقرر کیے ہوئے کمیشن کے بتائے گئے ہیں۔

(۳) اس کمیشن نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے پرسنل لا پر پوری بیدردی سے ہاتھ مضام کیا ہے۔ در انحالیکہ دستور نے نہایت واضح الفاظ میں اس بات کی ضمانت دی ہے کہ ان معاملات میں کتاب و سنت کی وہی تعبیریں معتبر ہوں گی جو کسی فرقہ کے لوگ پیش کریں گے۔

اس تفصیل سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہمارے نئے دستور کے بعد اس کمیشن کی کوئی قانونی حیثیت باقی نہیں ہے۔ میں جبران ہوں کہ حکومت نے ایک خلاف آئین کمیشن پر قومی فنڈ کا

روپیہ کیوں خرچ کیا؟ اور اگر حکومت اپنی اس غلطی پر متنبہ نہ ہو سکی تھی تو ارکان کمیشن نے ان کو ایک بالکل غلط کام پر قوم کا روپیہ کیوں ضائع کرایا؟ کیا کمیشن کے فاضل ارکان اپنے دستور سے بھی

انہی ہی واقفیت رکھتے ہیں جتنی واقفیت وہ قرآن و حدیث سے رکھتے ہیں۔ یا اسلام میں
تربیات پیش کرنے کا ان حضرات پر اتنا شوق غالب تھا کہ اس دفع حقیقت کی طرف توجہ
دینے کی انہوں نے ضرورت ہی نہیں محسوس کی ؟

ارکانِ کمیشن کے چند نظریات

اس رپورٹ کے شروع میں ایک تمہید اور اس کے آخر میں ایک خاتمہ ہے جن میں
ارکانِ کمیشن نے اپنے کچھ نظریات اور چند اصولِ اجتہاد بیان کیے ہیں۔ یہ نظریات اور
یہ اصول اجتہاد مختلف اعتبارات سے ہمارے نزدیک بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔
اول تو کمیشن نے جو سفارشات پیش کی ہیں وہ تمام نراہنی نظریات اور اجتہاد کے
انہی اصولوں پر مبنی ہیں۔ اس وجہ سے سفارشات پر غور کرنے سے پہلے ان کو سمجھ لینا ضروری
ہے۔ ثانیاً انہی سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ مذہب پر غور کرنے کے معاملے میں قدیم اور جدید
نقطہ ہائے نظر میں کیا فرق ہے؟ ثانیاً انہی سے یہ پتہ چلے گا کہ دراصل معاملہ صرف نکاح
و طلاق کے قوانین ہی کی اصلاح کا نہیں ہے بلکہ پورے دین کی اصلاح کا ہے اور یہ اس راہ
میں صرف پہلا قدم ہے۔

ان وجوہ سے میں چاہتا ہوں کہ کمیشن کے ان نظریات اور ان اجتہادی اصولوں کا بھی
جائزہ لیا جائے۔ لیکن اصل بحث سے پہلے میں اس رپورٹ کی ایک خاص خصوصیت کو ظاہر کر دینا
چاہتا ہوں۔ اس میں ارکانِ کمیشن نے اپنے اہل نظریات صاف صاف الفاظ میں پیش کرنے
کے بجائے ان کو اسلام اور قرآن کی تفسیر و توضیح کے پردوں میں لپیٹ کر پیش کرنے کی

کوشش کی ہے۔ پہلے اسلام کی ابدیت و ازلیت پر، اس کے مطابق عقل و فطرت ہونے پر اس کے چمکدار اور ہر ماحول کے ساتھ سازگار ہونے پر، ایک شاندار تمہید ہوتی ہے اس کے بلند و نظریہ یا اصول اجتہاد بیان ہوتا ہے جو ارکان کمیشن پیش کرنا چاہتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ طریقہ انھوں نے محض پردہ داری کے لیے اختیار کیا ہے تاکہ لوگ پہلی ہی نظر میں بھڑک نہ جائیں یا یہ حضرات ذہنی الجھن کے مرض میں کہ بیک وقت متضاد قسم کی باتیں کہتے ہیں اور اس تضاد کو محسوس نہیں کرتے۔

مذہب کے متعلق کمیشن کا نظریہ | مذہب ان حضرات کے نزدیک چند ایسے بنیادی خلائق اور اصولوں پر ایمان رکھنے کا نام ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتے، جو امٹ ہیں، جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں، جو لوح محفوظ میں ثبت ہیں۔ جو حکمت میں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

”مذہب قرآن کی تعریف کی رو سے، نام ہے فطرت کے ان ناقابل تغیر قوانین اور زندگی کے ان بنیادی اصولوں پر ایمان رکھنے کا جو تبدیل نہیں ہوتے ریاست اور معاشرہ جب تبدیل ہوتے ہیں۔ یا کسی اہم تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو وہ صرف اپنے بالائی ڈھانچے ہی میں تبدیلی کرتے ہیں۔ ان ابدی اور استحکم اصولوں میں کوئی تصرف نہیں کرتے جو قرآن کے ارشاد کے مطابق تمام مذہب کی اساس ہیں۔ اسلام کا مطالبہ بنی نوع انسان سے اپنی چند بنیادی اصولوں کو تھامے رکھنے کے لیے ہے جن کو قرآن کی پُرکنا یہ زبان میں یوں تعبیر کیا گیا ہے کہ وہ اس لوح محفوظ میں امٹ طور پر ثبت ہیں جو ام الکتاب یا تمام زندگی اور موجودات کا سرچشمہ ہے۔ ان بنیادوں کو نہ کسی تبدیلی کرنے کا حق ہے نہ اختیار۔ یہ حکمت میں اس کے بعد ایک حدیث کا

حوالہ دیا گیا ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو اظلم الناس قرار دیا ہے جو ایسے امور سے متعلق سوالات کرے جن میں لوگوں کو رائے اور عمل کی آزادی بخشی گئی ہے اور اس کے سوال کے سبب سے لوگوں پر کوئی پابندی عائد ہو جائے، پھر ارشاد ہوتا ہے، وسیع دائر میں قانون کی آزادی سے متعلق پیغمبر صلعم کا یہ طرز عمل اسلامی اصول فقہ کے اس مسلمہ اصول کی بنیاد ہے کہ جو چیز سختی طور پر ممنوع نہیں ہے وہ اجناسی اور شخصی فلاح و بہبود کے لیے اختیار کی جائے تو جائز ہے اور ان معاملات میں قانون سازی کی آزادی کا ایک چارٹر ہے جن کے بارے میں کوئی قطعی حکم موجود نہیں ہے۔“

گزٹ آف پاکستان ۱۲۵۵

مذہب کا یہ تصور لفظ بہر بہت معصومانہ نظر آتا ہے لیکن اس کی تہہ میں اتنی تو اندازہ ہو گا کہ یہ تصور قرآن کا دیا ہوا نہیں ہے بلکہ باطنیہ کا دیا ہوا ہے جس طرح انھوں نے چند غیر معلوم اور عنفا صفت خفایا کو مذہب کی اساس بنا کر ساری زندگی کو شریعت اور قانون کی پابندیوں سے آزاد کر دیا، اسی طرح یہ حضرات بھی چند لا معلوم الا حکم لہی اور ”ابدی“ اصولوں کو، جو لوح محفوظ میں ثبت ہیں، واجب التسلیم مان کر بقیہ ساری زندگی سے مذہب کو خارج کر دیا جاتے ہیں، کوئی ان حضرات سے پوچھے کہ قرآن نے مذہب کا یہ تعریف اپنے کس پارے اور کس سورہ میں کی ہے؟ فطرت کے وہ ناقابل تغیر اور زندگی کے وہ بنیادی اصول کیا ہیں جن کو مان لینے کا نام مذہب ہے؟ ان کا کوئی نام اور خارج میں ان کا کوئی وجہ بھی ہے یا معن کمیشن کے ارکان کے ذہنوں ہی میں ان کا وجود ہے؟ میں نے اس پوری رپورٹ کی سطر سطر پڑھی ہے لیکن مجھے اس میں ان ناقابل تغیر اور امٹ

اصولوں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اس رپورٹ میں تو خود قرآن کو بھی، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا، زمانہ کے ساتھ ساتھ بدل جانے والا اور مٹ جانے والا قرار دیا گیا ہے پھر آخر وہ ابدی اصول کہاں ہیں؟ اگر یہ ازلی اور ابدی اصول صرف لوح محفوظ ہی میں ثبت ہیں تو یہ واضح ہونا چاہیے کہ ہماری زندگی کے ساتھ ان اصولوں کا ربط کس چیز کے واسطے سے قائم ہوتا ہے؟ کیونکہ ہمارے سامنے تو صرف قرآن اور سنت ہی ہیں لوح محفوظ تک رسائی تو صرف اہل کائنات کی ہی ہوگی، ہم سچ میرزوں کی رسائی تو وہاں تک نہیں ہے۔

یہ حضرات مذہب کا ایک گول مول اور خفا متناصق تصور کر رہے ہیں تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ مذہب کو مولویوں نے خواہ مخواہ کو ایک ہوتا بنا رکھا ہے، وہ تو ایک نہایت مختصر اور سادہ سی چیز ہے، بس لوح محفوظ میں لکھے ہوئے چند ازلی اور ابدی حقائق ہیں ان کو مان لیجیے۔ اللہ اذنہ خیر سلّا۔ بقیہ ہماری ساری زندگی تو خود ہمارے حوالہ کی گئی ہے کہ ہم اس کو جس طرح چاہیں گزاریں اور اس کے لیے جو چاہیں قوانین و احکام ایجاد کریں۔ مذہب کو اس سے کیا سروکار۔ پیغمبر نے تو ان لوگوں کو سختی سے ڈانٹا تھا جو ان ازلی اور ابدی حقائق کے بنا دینے کے بعد بھی سوالات پوچھ پوچھ کر پابندیوں میں اضافہ کرانا چاہتے تھے، پیغمبر تو ہمیں ساری زندگی سے متعلق قانون سازی کا اختیار مطلق سنپ گئے ہیں۔ لوگ خواہ مخواہ کو بات بات پر مذہب کو بیچ میں لاتے ہیں۔

مذہب بالخصوص اسلام کے متعلق یہ تصور میرے نزدیک کسی مسلمان کا نہیں ہو سکتا یہ تصور، جیسا کہ میں نے عرض کیا، یا تو باطلینہ کا ہے یا اباحت پسندوں کا جو مذہب کا نام لینے ہوئے اپنی خواہشات نفس کی نیندگی کرنا چاہتے ہیں۔ مذہب صرف چند بنیادی

اصولوں کے مان لینے ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک پورے نظام زندگی کا نام ہے جتنی وسعت زندگی کے اندر ہے اتنی ہی وسعت مذہب کے اندر ہے۔ جتنے پہلو زندگی رکھتی ہے، اتنے ہی پہلو مذہب رکھتا ہے۔ زندگی فکر و نظر اور ادراک و تعقل کی نعمت سے بہرہ ور کی گئی ہے اس وجہ سے مذہب عقل کی رہنمائی کے لیے رہنما اصول دینا ہے۔ زندگی چونکہ کل کے لیے بنی ہے اس وجہ سے وہ اعمال کو ٹھیک کرنے کے لیے بھی ایک جامع پروگرام دینا ہے۔ زندگی کو چونکہ خاندان، سوسائٹی، معاشرہ، سیاست اور حکومت سب سے رابطہ پیش آتا ہے اس وجہ سے ان سارے شعبوں میں بھی وہ چاروں گوشے (FOUR CORNERS)

متعین کرنا ہے جن کے اندر رہ کر انسان نلاح حاصل کر سکے۔ پھر زندگی کو چونکہ مرنے کے بعد بھی باقی رہنا ہے اس وجہ سے مذہب آخرت کی کامیابی کے اصول بھی بتاتا ہے! الغرض مذہب نے ہماری زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا ہے جس کی حد بندی نہ کر دی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان چاروں گوشوں کے اندر ہمیں اس نے قانون بنانے کی آزادی بھی بخشی ہے لیکن یہ آزادی سترے پہاڑ کی آزادی نہیں ہے کہ ہم چاروں حدیں توڑ کر جہر چاہیں کل جائیں۔ بلکہ اس نے یہ ہدایت کی ہے کہ جو معاملات ہمارے سامنے ایسے آئیں جن میں خدا اور رسول کی طرف سے کوئی دفعہ ہدایت موجود نہ ہو تو وہاں ہمیں خدا اور رسول کے معلوم احکام کے اشارات، ان کے مقتضی اور ان کی روح کو سامنے رکھ کر کوئی ایسی بات متعین کرنی چاہئے جو ہمارے علم و فہم کے حد تک ان معلوم احکام سے زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھنے والی ہو اس چیز کو اسلام کی اصطلاح میں اجتہاد سے تعبیر کیا گیا ہے جس پر ہم آگے چل کر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

یہاں زندگی کے ہر شعبے اور گوشے سے متعلق اسلام کے احکام کا حوالہ دینا تو ممکن

نہیں ہے لیکن ہم بطور مثال ازدواجی زندگی سے متعلق جو اس کمیشن کے زیر بحث ہے، اسلام کے ان چند احکام کا حوالہ دیتے ہیں جو ہماری زندگی کے اس حصہ کی حد بندی کرتے ہیں۔ وہ احکام یہ ہیں :-

عورت اور مرد کے درمیان جائز رشتہ صرف نکاح کا رشتہ ہے جو مہر اور احصائے کی شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ محرمات سے نکاح ناجائز ہے۔ میاں اور بیوی دونوں پر یکساں حقوق اور یکساں ذمہ داریاں ہیں لیکن خاندان کی شیرازہ بندی کے لیے مرد کو عورت پر قوامیت حاصل ہے۔ نان نفقہ کی ذمہ داری مرد پر ہے۔ نکاح کی گرہ کو کھونا اور باندھنا صرف مرد کے اختیار میں ہے عورت کسی نا انصافی کی صورت میں خلع کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ مرد شوہر کی صورت میں عورت کو مناسب تادیب کر سکتا ہے۔ مرد کسی اجتماعی یا خاندانی یا شخصی مصلحت کے تحت عدل کی شرط کے ساتھ ایک سے لے کر بیک وقت چار تک نکاح کر سکتا ہے، لیکن عورت بیک وقت ایک ہی مرد کے نکاح میں رہ سکتی ہے۔

یہ اور اسی طرح کے چند اصولی احکام خود قرآن نے دیے ہیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان احکام کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت فرمائی ہے۔ ان سب کو ملا دینے سے اس خاندانی نظام کا پورا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے جو اسلام میں مطلوب ہے۔ میں ارکان کمیشن سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ازدواجی زندگی سے متعلق یہ اصول ان بنیادی اصولوں میں شامل ہیں یا نہیں۔ جو ارکان کمیشن کی لوح محفوظ میں ثبت ہیں، جو امٹ میں اور جن کو ماننا ضروری ہے، ارکان کمیشن کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے معاملات میں سوالات کرنے سے روکا ہے۔ آپ نے لوگوں کے ہزاروں سوالات کے نہ صرف جوابات نہایت خندہ پیشانی سے دیے ہیں بلکہ سوال کرنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی ہے۔ انہی

لے ملک میں کا ذکر ہم نے اس لیے نہیں کیا کہ اب یہ چیز خارج از بحث ہے۔

سوالات کے ذریعہ سے قرآن کے بہت سے اجمال کی وضاحت ہوئی ہے۔ اور بہت سی نئی صورتوں کے لیے شریعت کا حکم معلوم ہوا ہے۔ جن لوگوں نے یہ سوالات کیے انہوں نے پابندیوں میں نہیں اضافہ کیا ہے بلکہ امت کے لیے برکتوں اور رحمتوں کے اضافہ کے موجب ہوئے ہیں۔ آپ نے اگر سوالات سے روکا ہے تو اس طرح کے سوالات سے روکا ہے جس طرح کے سوالات بنی اسرائیل کیا کرتے تھے۔ مثلاً ان کو گائے کی قربانی کا حکم دیا گیا تو انہوں نے یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ اس کے سینک اور اس کی دم کیسی ہو؟ اس کی عمر کتنی ہو؟ اس طرح کے بے فائدہ اور غیر ضروری سوالات کو حضور نے ناپسند فرمایا ہے۔ بہر حال ارکان کمیشن نے دین کا یہ تصور جو پیش کیا ہے کہ وہ صرف چند اصولوں کے مان لینے کا نام ہے۔ وہ اس دین کا تو ہو سکتا ہے جو ان کے اپنے ذہنوں میں ہے، لیکن یہ حکم کا تصور نہیں ہے۔ اسلام تو، جیسا کہ عرض کیا گیا، ایک پورا نظام زندگی ہے اور اس پورے کو بلا کسی تقسیم و تفریق کے ماننے کا مطالبہ ہے۔ اس کے کسی ایک جزو کا انکار سب کا انکار ہے۔ قرآن حکیم کے متعلق ارکان کمیشن کا تصور اسی طرح اسلام کی اذلیت و ابدیت پر ایک شاندار خطبہ دینے کے بعد قرآن حکیم کے متعلق یہ ارشاد ہوتا ہے :-

”اسلام دوسرا نام ہے زندگی کے ان اصولوں کا جو زمین کے اس مذکورہ جز سے متاثر نہیں ہوتے جس سے دنیا کی مادی دوسری قوموں کو متاثر ہونا پڑتا ہے۔ یہ اسلام نہیں، بلکہ انسانی تعلقات کی وقتی اور زمانی ضابطہ بندیاں ہیں، جو برابر تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ قرآن کے عین زمانہ نزول میں حالات کی تبدیلی کے سبب سے اس کے بعض احکام تبدیل ہو گئے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی زندگی نے بدنام اور

اور ترقی کرنا بند کر دیا ہے۔ اور ان بہت سے قدیم قوانین کو منسوخ کر کے نہیں رکھ دیا ہے جو کبھی انسانی زندگی کے لیے نہایت ضروری خیال کیے جاتے تھے۔ (گزشتہ آف پاکستان ص ۱۳۲)

پہلے اس عمیق کلام کا مطلب سمجھ لیجیے اس کے بعد اس سے نکلنے والے حقائق پر غور کیجیے گا۔ ان حضرات کا فرمانا ہے کہ اسلام کے ابدی اصول تو بے شک تبدیل نہیں ہوں گے لیکن اسلام نے انسانی زندگی کے مختلف گوشوں میں جو ضابطہ بن دیا ہے اس میں وہ تو برابر تبدیل ہوتی رہی ہیں اور زمانہ اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ برابر تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ زندگی کے ایک خاص دور میں انسان کے لیے جو لباس تراشنا جانا ہے زندگی کے دوسرے دور میں وہ بیکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے دور طفولیت میں خاندان کے لیے، سوسائٹی کے لیے جو ڈھانچے تجویز کیے گئے تھے وہی ڈھانچے ہمیشہ نہیں قائم رکھے جاسکتے۔ امیر اور مساکین، زمیندار اور مزدور، محنت اور سرمایہ کے درمیان جو نسبتیں کل تک قائم تھیں۔ اب وہ بدل چکی ہیں اس وجہ سے وہ نظام بھی بدل جانا چاہیے جو پچھلی نسبتوں کو پیش نظر رکھ کر بنا تھا۔ ایک خاص طرح کے معاشرتی اور اقتصادی ماحول میں میاں اور بیوی کے درمیان تعلقات کی جو شکل تجویز ہوئی تھی معاشرتی اور اقتصادی ماحول تبدیل ہو جانے سے لازماً وہ شکل بھی بدل جائے گی۔ اگر کل خاندان کا نظم اس نظریہ پر قائم کیا گیا تھا کہ مرد قوام ہے تو ضروری نہیں کہ یہی نظریہ آج بھی قائم رہے۔ ہو سکتا ہے کہ آج یہ نظریہ قائم کر لیا جائے کہ عورت قوام ہے اور پھر خاندان کا کچھلا سارا ڈھانچہ توڑ پھوڑ کر از سر نو بنایا جائے۔ لیکن یہ محض ڈھانچے کی تبدیلی ہوگی اسلام کے ابدی اصولوں کی تبدیلی نہیں ہوگی، وہ تو بدستور محفوظ رہیں گے۔ آخر قرآن کے بہت سے احکام حالات کی تبدیلی کے ساتھ عین اس کے زمانہ نزول میں بدل جاتے ہیں

تو اب اس کے احکام کیوں تبدیل نہیں ہو سکتے؟ قرآن نے ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے جو ڈھانچہ دیا ہے وہ تو محض ڈھانچہ ہے۔ وہ کوئی اسلام کے ابدی اصول تصور سے ہی ہیں وہ اگر رد بدلے رہیں تو اس سے قرآن اور اسلام کا کیا گرفتار ہے؟ ابدی اصول تو لوح محفوظ میں محفوظ ہی ہیں۔

یہ ہے ان حضرات کے مذکورہ بالا ارشاد کا مطلب، اگر اس کو پوری طرح الفاظ کے بجائے سادہ الفاظ میں بیان کیا جائے۔ یہ حضرات بار بار جب اسلام کے ابدی اصولوں اور بنیادی اصولوں کا ذکر فرماتے ہیں اور یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ یہ ابدی اصول کبھی تبدیل نہیں ہوتے تو آدمی اس خوش گمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کم از کم قرآن تو سراسر ان ابدی اصولوں کا مجموعہ ہے اس وجہ سے اس میں یہ حضرات کسی تبدیلی کی سفارش کی جہالت نہیں فرمائیں گے۔ لیکن آپ نے سن لیا کہ یہ قرآن بھی ان ابدی اصولوں کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس نے بھی ہماری انفرادی، ہماری عائلی، ہماری معاشرتی، ہماری معاشی، اور ہماری اجتماعی و سیاسی زندگی کے جو ڈھانچے کھڑے کیے ہیں وہ سب کے سب نفی اور زمانی ہیں، وہ ہمیشہ قائم نہیں رکھے جاسکتے، بلکہ یہ تو اتنے پودے اور گھس پھسے ہیں کہ عین زمانہ نزول قرآن میں جب کہ ان میں ان پر چند برساتیں بھی نہیں گزری تھیں، حالات کی تبدیلی کے تحت ان میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اور اب تو اس کے قائم کیے ہوئے کتنے ڈھانچے ہیں جو بالکل ہی فرسودہ اور بے مقصد ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسی طرح آئندہ بھی اگر زندگی کو تیسرے ترقی سے نہیں روکا جاسکتا، تو قرآنی احکام کو تغیر و تبدل اور اصلاح و ترمیم کی زد سے بھی نہیں بچایا جاسکتا؟ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر ان عظیم صفت اصولوں کا منبع کہاں ہے جن کو یہ حضرات اذیت و اذیت کا مقام بلند نظر فرماتے ہیں؟ وہ سانسے کے سانسے لوح محفوظ ہی میں ہیں

یا ان کا کوئی حصہ قرآن میں بھی ہے؟ اگر ان کا کوئی حصہ قرآن میں بھی ہے تو ارکانِ کمیشن سے الگ ہے کہ وہ اس حصہ پر نشان لگا دیں تاکہ مسلمان اطمینان کا سانس لیں کہ کم از کم اتنا حصہ خواہ وہ کتنا ہی قلیل بھی ہو۔ زمانہ کی دستبرد، ارکانِ کمیشن کے کھلبلیج سے محفوظ رہے گا۔ قرآن کا وہ سارا حصہ جو انسانی تعلقات کی ضابطہ بندی کرتا ہے وہ تو ہم نے سمجھ لیا کہ وہ سب کا سب معرضِ خطر میں ہے۔ عبادات میں سے بھی اکثر کا مستقبل تاریکی کی نظر آتا ہے کیونکہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور قربانی بھی کسی نہ کسی نوعیت سے وقت کے معاشی، سماجی اور اقتصادی نظریات سے متصادم ہیں۔ اخلاق اور آداب کی بھی غیر نظر نہیں آتی ہے کیونکہ یہ تو ہیں ہی مگر انسانی تعلقات کے تابع، جہلاً آج عفت، حیا و نفاذی اور صداقت کے وہ معیارات کیا کام دے سکتے ہیں جن کا چلن آج سے سینکڑوں سال پہلے رہا ہے؟ رہے عقائد تو ان میں سے ممکن ہے کوئی اتنا سخت جان نکلے کہ اس طوفانِ حوادث کا مقابلہ کر سکے لیکن اس کا نتیجہ بھی جیسا ہو سکتا ہے جب ارکانِ کمیشن اپنے کیمیائی تجزیہ کے بعد یہ اطمینان دلا دیں کہ فلاں عقیدے کا انسانی زندگی سے دور قریب کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے کیونکہ جہاں تک ہمارے ناقص علم کا تعلق ہے ہم تو یہی جانتے ہیں کہ جتنے بھی عقائد ہیں سب ایک طرف انسان کا تعلق خدا کے ساتھ جوڑتے ہیں، دوسری طرف انسان کا تعلق انسان کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ اس وجہ سے ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو انسانی زندگی اور انسانی روابط (HUMAN RELATIONS) سے بے تعلق ہو۔ اب تک یہ قائم رہے تو شاید اس وجہ سے قائم رہے کہ اہلِ عالم یہ عقائد تھے نہ کہ انسانی تعلقات لیکن اب اگر اہلِ عالم کی حیثیت تعلقاتِ انسانی کو حاصل ہو گئی ہے تو لازماً ان کو بھی اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی۔

بہر حال ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ قرآن کے متعلق اس نظریہ کے بعد اس کی کوئی چیز بھی منسوخ ہونے سے بچ سکے گی۔ لیکن اگرچہ سکے گی تو ارکانِ کمیشن کا اس امت پر بڑا احسان ہوگا اگر تعین کے ساتھ اس کا نام بتا دیں تاکہ میں اطمینان ہو کہ قرآن کے میں پاروں میں سے کچھ چیزیں ایسی ہیں جو باقی رکھی جائیں گی۔

سنت کے متعلق ارکانِ کمیشن کا نظریہ | اس رپورٹ میں سنت کا لفظ اگرچہ بار بار دہرایا گیا ہے لیکن جب ان حضرات کے نزدیک قرآن کی بھی ہر چیز منسوخ ہو سکتی ہے تو پھر غریب صیغہ اور سنت کس گنتی میں ہیں؟ اس لفظ کو رپورٹ میں بار بار دہرانے کی عبوری غالباً یہ پیش آئی ہے کہ ان کی بدست سے یہ لفظ دستور میں استعمال ہو گیا ہے۔ جب دستور میں استعمال ہو گیا تو مشہور مثل کے مطابق گئے پڑا ہوا دھول بجانا ہی پڑتا ہے۔ اور نہ جن حضرات نے قرآن کو نہیں بخشا ہے وہ سنت کو کب بخشے والے ہیں۔ چنانچہ ایک بھر پور وارِ سنت پر بھی اس رپورٹ کے آخر میں کیا گیا ہے۔ اس کے آخر میں ان حضرات نے حکومتِ پاکستان کو یہ نصیحت کی ہے کہ اگر وہ محض قانونِ اسلامی کی پرانی تعبیرات ہی پر قانع ہو کر رہ گئی تو وہ اس ملک میں کوئی بھی موثر اصلاح نہیں کر سکے گی۔ اگر وہ فی الواقع کوئی اصلاح کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے اس کو انقلابی قدم اٹھانا پڑے گا۔ اس دلپذیر نصیحت کا اختتام علامہ اقبال مرحوم کے ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

”مستقبلِ قریب میں جو سوال تمام مسلم ممالک کے سامنے آنے والا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی قانون، ارتقا کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑی ذہنی کاوش کا مطالبہ کرتا ہے اور اس کا جواب قطعاً اثبات میں ہو سکتا ہے بشرطیکہ عالمِ اسلامی اس سوال کو اس اپرٹ کے ساتھ حل کرنے کے لیے آمادہ ہو جو حضرت عمرؓ کے اندر تھی، جو اسلام میں پہلے نقاد اور آزاد خیال فرد ہیں،

جہوں نے پیغمبر صلعم کے آخری وقت میں یہ شاندار الفاظ کہنے کی جرأت دکھائی
کہ حسینا کتاب اللہ (ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے)

میں یہاں علامہ اقبال مرحوم کے ان الفاظ پر خود ان کے الفاظ کی حیثیت سے کوئی
بحث نہیں کرنا چاہتا۔ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اس وجہ سے یہ معلوم کرنا کہ اس مبہم
ارشاد سے ان کا مدعا کیا تھا، ممکن نہیں رہا۔ لیکن پیش کرنے والوں نے اس کو جس سیاق و
سیاق میں پیش کیا ہے وہ صاف یہی ہے کہ حدیث و سنت کی معروف پابندیوں کے ساتھ
اس ملک میں تجدید و اصلاح کا کوئی انقلابی قدم نہیں اٹھایا جاسکتا۔ اگر کوئی انقلابی قدم اٹھانا
ہے تو یہ حسینا کتاب اللہ کے انقلابی نعرہ کی ساتھ اٹھایا جاسکتا ہے۔

”حسینا کتاب اللہ“ کا نعرہ لگانے والے یہ حضرات قرآن کے متعلق جو تصور
رکھتے ہیں اس کا بیان تو تفصیل کے ساتھ اوپر ہو چکا ہے۔ اب حدیث اور سنت سے متعلق
ان کے نقطہ نظر کا اندازہ مذکورہ بالا اقتباس سے کر لیجیے۔ آخر علامہ اقبال کے اس قول کا
حوالہ دینے کا منشا اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر خلیفہ راشد
اور ڈاکٹر اقبال جیسے شاعر و فلسفی دونوں کو بیک وقت حدیث اور سنت کے خلاف کھڑا
کر دیا جائے۔ ایک عام آدمی جب یہ دیکھے گا کہ علامہ اقبال نے یہ بات لکھی ہے تو ان کی شہرت
کے پیش نظر اس کے دل میں اس بات پر اعتماد پیدا ہوگا کہ یہ سرسری اور سطحی نہیں ہو سکتی۔
پھر جب وہ یہ پڑھے گا کہ حضرت عمرؓ نے عین رسول اللہ کی وفات کے وقت یہ بات
کہی کہ ہمیں رسول اللہ کی کسی رہنمائی کی ضرورت نہیں، ہمارے لیے تو کتاب اللہ کافی
ہے تو وہی اثر اس کے اوپر پڑنے متوقع ہیں۔ اگر وہ خدا ترس اور حفاظ آدمی ہوگا تو حیران
دستار سمجھ کر رہ جائے گا کہ یہ کیا بات ہوئی؟ اور اگر بالکل سچی اور سرسری ذہن کا آدمی

ہوگا تو عجب نہیں کہ منکرین حدیث کا ممنوا بن جائے کہ سب انگلوں میں سے حضرت عمرؓ
اور پھیلوں میں سے ڈاکٹر اقبال جیسے لوگ قرآن کے ہوتے حدیث اور سنت کی ضرورت
محسوس نہیں کرتے تو پھر آخر مولوی لوگ اس کو بلاوجہ کیوں اتنی اہمیت دیتے ہیں۔

بجائے اللہ علیہ وسلم کی آخری بیاری میں جس واقعہ کے تعلق سے حضرت عمرؓ کی طرف
یہ بات منسوب کی جاتی ہے، وہ ایک اختلافی اور نزاعی واقعہ ہے۔ مولانا شبلی نورانی
سے اس واقعہ کی منکر ہیں۔ اس کے منکر تو بعض اور دوسرے عقیدین بھی ہیں لیکن میں
نے مولانا شبلیؒ کا حوالہ دو وجہوں سے دیا ہے ایک تو اس وجہ سے کہ حضرت عمرؓ پر جیسی
محققانہ کتاب انھوں نے لکھی ہے کسی اور نے نہیں لکھی ہے۔ دوسری یہ کہ ہمارے اس
کمیشن نے جن تین چار آدمیوں کو نقاد اور آزاد خیال مانا ہے ان میں ایک مولانا شبلی
بھی ہیں۔ میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جس روایت کی بنیاد پر یہ حضرات، حضرت عمرؓ کو اسلام
میں پہلا نقاد اور آزاد خیال مانتے ہیں کمیشن کے ممدوح مولانا شبلیؒ اس روایت کی سرے
سے کوئی بنیاد ہی تسلیم نہیں کرتے بلکہ خرض کیجئے کہ حضرت عمرؓ نے یہ بات فرمائی ہے
تو یہاں کے ساتھ کہاں کا انصاف ہے کہ ان کے اس قول کو وہ معنی پہنچائے جائیں جو خواجہ
یار و خضر یا منکرین حدیث و سنت نے اس کو پہنچائے ہیں۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ
”حسینا کتاب اللہ“ ہمارے لیے اللہ کافی ہے تو اس سے یہ کہاں سے نکل آیا کہ وہ کتاب کی
ضرورت کا قائل نہیں ہے یا رسول کی ضرورت کو تسلیم نہیں کرتا ہے، اسی طرح اگر یہ کہا
جائے کہ حسینا کتاب اللہ تو اس سے حدیث یا دوسرے مآخذ دین کی نفی کیسے
ہوگئی؟ جس طرح لفظ اللہ کے اندر کتاب اور رسول سب شامل ہیں اسی طرح کتاب اللہ
کے اندر سنت رسول اللہ شامل ہے۔ حضرت عمرؓ کی پوری زندگی اس بات کی شاہد

ہے کہ انھوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کبھی کوئی تفریق نہیں کی۔ سنت تو درحقیقت کتاب اللہ کی شرح و تفسیر ہے۔ پھر اس کو کتاب اللہ سے الگ کس طرح کیا جاسکتا ہے؟ جس انسان نے بلا اختلاف اس امت کی سب سے زیادہ خدمت کی جو رسول اللہ کی زندگی میں بھی اور آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے ایک ایک نقش قدم کا متلاشی رہا جس نے اپنے شاندار دور حکومت میں ان ساری باتوں کا عملاً مظاہرہ کر دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے تھے آخر اس کی خدمت میں ان حضرات کی طرف سے یہ کونسا خراج تحسین ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئے لگی تو اس نے سنت رسول کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا؟ میرے نزدیک تو فاروق اعظم کی نسبت اس طرح کی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کے دل کے اندر ان کے خلاف نہایت گہرا عناد پوشیدہ ہو۔

ان حضرات نے حضرت عمرؓ کو اسلام میں پہلا نقاد اور آزاد خیال جو قرار دیا ہے اس کی وجہ یہی تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کی زندگی کے حالات سے یہ لوگ بالکل ہی بے خبر ہیں۔ ان کے متعلق سنی سنائی بات کا توں میں اگر پڑی ہوئی ہے تو بس یہ ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت "حسبنا کتاب اللہ" کا انقلابی نعرو بلند کیا تھا، اس کے سوا اور کسی بات کا ان لوگوں کو پتہ نہیں ہے اگر اور باتوں کا بھی پتہ ہوتا تو یہ لوگ ان کو اسلام میں پہلا نقاد اور پہلا آزاد خیال قرار دینے کے بجائے غالباً ان کو پہلا رحمت پسند قرار دیتے کیونکہ جن باتوں کو ان حضرات نے اس رپورٹ میں اسلام کی آزادانہ روح کے منافی قرار دیا ہے یا جن کو بدعت ٹھہرایا ہے یا جن کو فکری جمود کی نشانی بتایا ہے تقریباً یہ ساری ہی باتیں ایسی ہیں جن کے حضرت عمرؓ قائل اور ان پر

عادل رہے ہیں بلکہ بعض تو ان کی ادبیات میں شمار ہوتی ہیں۔ اور ایسی تو بلا استثناء سب ہی میں جوان کی وسیع سلطنت میں، جو عرب، عراق، ایران، شام اور مصر سب پر پھیلی ہوئی تھی، برابر ہوتی رہی ہیں، لیکن اصلاحات کے انتہائی دلدادہ ہونے کے باوجود اپنے آٹھ نو سال کے دور حکومت میں کبھی ان کو ان چیزوں کی اصلاح کا کوئی خیال نہیں آیا۔

ایک ہی وقت میں دی ہوئی تین طلاقیں کو یہ حضرات بدعت قرار دیتے ہیں اور ان کو انھوں نے کالعدم قرار دینے کی سفارش کی ہے۔ لیکن اگر یہ بدعت ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ اس بدعت کے بانی حضرت عمرؓ ہی ہیں۔ سولہ ادا اٹھارہ سال سے کم عمر کی شادیاں کمیشن کی رپورٹ میں جرم قرار دینے کی سفارش کی گئی ہے۔ اگر یہ جرم ہے تو اپنی زندگی کے آخری دور میں حضرت ام کلثوم کے ساتھ نکاح کر کے اس جرم کا بھی ارتکاب حضرت عمرؓ کو چھپے ہیں۔ بلکہ حضرت ام کلثوم کے والد ماجد حضرت علیؓ بھی، جو تمام امت میں سب سے بڑے فقیہ مانے جاتے ہیں، اس جرم میں شریک ہوئے کیونکہ یہ رشتہ انہی کی اجازت سے ہوا۔ پردہ سبب بہر حال ارکان کمیشن کے نزدیک ایک شدید جرم ہی ہوگا۔ اس جرم میں بھی ولایت کا شرف حضرت عمرؓ ہی کو حاصل ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی مطہرات جب پردہ نہیں کرتی تھیں تو حضرت عمرؓ اس تمنا کا اظہار بار بار کرتے تھے کہ کاش یہ پردہ کر میں۔ چنانچہ انہی کی آرزو کے مطابق حجاب کا حکم نازل ہوا۔ طلاقیں بھی انھوں نے دیں اور ان کی مطلقہ بیویوں میں ایک مسلمہ بھی تھیں لیکن ان کو طلاق دینے کا کوئی معقول سبب آج تک کسی کو نہیں معلوم ہو سکا۔ عجیب نہیں کہ بیک وقت ان کے نکاح میں ایک سے زیادہ بیویاں بھی رہی ہوں۔ اور اگر خود ان کے نکاح میں ایک سے

زیادہ بیویاں نہیں رہی ہیں تو ان کی وسیع سلطنت میں تو بہر حال تعدد ازدواج پر کوئی پابندی عائد نہیں تھی۔ یہ ساری باتیں اگر جرم میں اور عین فقہی تصدیق تشدد کے سببے دین میں داخل ہو گئی ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہما میں پہلے نفاذ اور پہلے آزاد خیال کیا ہوئے جب کہ انھوں نے حکومت اور اقتدار رکھتے ہوئے نہ صرف یہ کہ ان کی کوئی اصلاح نہیں کی بلکہ ایسے اپنے طرز عمل سے ان کو اور زیادہ اجاگر کر دیا ہے کیا محض اس کا نام ہے پر ان کو آزاد خیال اور نفاذ قرار دیا جا رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخروقت میں انھوں نے حسب کتاب اللہ کا اعلان کرنے کی جرأت کی ہے اگر یہی وجہ ہے تو اول تو، جبکہ عرض کیا گیا، اس بات کی نسبت ہی ان کی طرف سبج نہیں ہے اور اگر صحیح ہے تو اس کا مدعا وہ ہرگز نہیں ہو سکتا جو یہ حضرات سمجھے ہیں۔ وہ آزاد اور نفاذ ضرور تھے لیکن اتنے نفاذ نہیں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی تنقید کر ڈالیں اور نہ اتنے آزاد خیال تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آنکھیں بند کرتے ہی ساری حدیث و سنت کی بساط لپیٹ کر رکھ دیں۔

فقہ اسلامی کے متعلق کمیشن کا نظریہ | اب آئیے فقہ اسلامی کے متعلق کمیشن کا نظریہ سنیں، اسلام کی سادگی اور اس کے ہر قسم کے رسمیات اور ہر قسم اصرار و غلو سے پاک ہونا ہے۔ ہونے پر ایک پر شوکت تہید کے بعد ارشاد ہوتا ہے :-

”زندگی ایک تخلیقی اور حالات کے ساتھ سازگار رہنمائی ہے اور یہ بے پیکر قوانین کے مقابل میں بصیرت کی زیادہ طالب ہے۔ اسلام کی ابتدائی سادہ اور آزاد روح کی تجدید ہونی چاہیے اور اسی کام میں رہنمائی کے لیے ہمیں اسلام کے آغاز کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جب کہ بعد کے اضافوں سے وہ بالکل

پاک تھا۔ بعد کے قوانین اور ضوابط کے مجموعوں کا مطالعہ محض تاریخی اہمیت کے واقعات کی حیثیت سے تو کیا جاسکتا ہے لیکن ان کو اسلام کی مجموعیت کے ساتھ ملایا نہیں جاسکتا۔“ گزشتہ پاکستان ۱۳۳۱ھ

اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ ارکان کمیشن کے نزدیک فقہ اسلامی کی کوئی دینی اور شرعی اہمیت نہیں ہے۔ اس کی ان کے نزدیک اگر کوئی اہمیت ہے تو وہ محض تاریخی پہلو سے ہے۔ جس طرح آپ طبری، کمال ابن اثیر اور تاریخ الخلفاء وغیرہ کی مدد سے ایک خاص دور کے حالات و واقعات معلوم کر لیتے ہیں، اسی طرح آپ مبسوط، مدونہ، اور کتاب الام سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کسی خاص دور میں ہمارے یہاں کیا قانونی رجحانات رہے ہیں۔ اس سے زیادہ ان فقہی اہمیت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

کمیشن نے ایک مقام پر شریعت اور فقہ کی بحث بھی چھیڑی ہے (ملاحظہ ہو ص ۱۲۰) اور وہاں یہ فرمایا ہے کہ ہم شریعت میں کوئی تبدیلی نہیں کر رہے ہیں۔ ہم اگر تبدیلی کر رہے ہیں تو فقہ میں تبدیلی کر رہے ہیں جس کی بنیاد تجربات پر ہے جس چیز کی بنیاد تجربات پر ہو وہ صرف علماء ہی کا اجارہ نہیں ہو سکتی۔ اس میں ہر شخص رائے دینی کر سکتا ہے جہاں تک فقہ اور شریعت کے درمیان فرق کا تعلق ہے اس سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا لیکن یہ بات کہ یہ فرق کس قسم کا ہے اور یہ کہ یہ حضرات جو کچھ تصرفات فرما رہے ہیں وہ صرف فقہ ہی تک محدود ہیں، شریعت ان کے حملوں اور ان کی ترکتا زلیوں سے محفوظ ہے، دونوں قابل بحث ہیں۔

شریعت اور فقہ میں جو فرق ہے وہ فرق ہرگز یہ نہیں ہے کہ شریعت میں اشخاص کو کوئی مداخلت کرنے کا حق نہیں ہے اور فقہ کی بنیاد جو کچھ تجربات پر ہے اور اس کی جو کچھ

اہمیت ہے، محض تاریخ کے پہلو سے ہے۔ اس وجہ سے اس میں ہر شخص اپنا قول لگا سکتا ہے۔
 شریعت اور فقہ میں جو لوگ یہ فرق بیان فرماتے ہیں، وہ یا تو شریعت سے بالکل ناواقف
 ہیں یا فقہ سے یا دونوں ہی سے بالکل بے خبر ہیں۔ شریعت اور فقہ میں جو فرق ہے وہ یہ ہے
 کہ شریعت ماخوذ ہے اور فقہ اس کاخذ سے ماخوذ ہے اور ان دونوں میں وہی نسبت ہے جو ماخذ
 اور ماخوذ میں ہوتی ہے جس حد تک اس کا اخذ صحیح ہے۔ اس حد تک یہ شریعت کا جزو ہے
 اس کو شریعت سے الگ نہیں کیا جاسکتا لیکن اگر اس کے کسی حصہ کے متعلق تعیند سے یہ ثابت
 ہو جائے کہ اس کے اخذ کرنے میں کوئی غلطی ہوئی ہے تو بلاشبہ وہ شریعت کا کوئی جزو نہیں ہے۔
 اب یہ ایک بالکل قدرتی امر ہے کہ فقہ کے کسی حصہ کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ اس کا اخذ
 صحیح ہے یا نہیں ہر ایسے غیرے کا کام نہیں ہو سکتا۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ماخذ اور
 اصل ماخذ دونوں پر معتقدانہ نظر رکھتے ہوں، عام اس سے کہ وہ علماء اس سے ہوں یا غیر علماء، اس سے
 تجربات کو فقہ میں دخل ضرور ہے لیکن وہ دخل اس نوعیت کا نہیں ہے کہ یہ تجربات ہی فقہ اسلامی
 کی اساس ہوں جن لوگوں نے یہ گمان کیا ہے وہ فقہ اسلامی کی تاریخ اور اس کے مواد سے بالکل ناواقف
 بے خبر ہیں۔ زندگی کے تجربات فقہ اسلامی کی تعمیر میں صرف اس نوعیت سے شریک ہیں کہ ان
 کی تحریر کیے ماہرین شریعت کو آمادہ کیا کہ وہ زندگی کے ان مسائل کا حل شریعت کے اشارات
 میں تلاش کریں جن کا حل شریعت کے واضح نصوص میں موجود نہیں ہے۔ نہ اس نوعیت سے
 کہ انہی تجربات کے انیٹ اور روٹے سے فقہ اسلامی کی عمارت کھڑی کر دی گئی ہو۔ ایک مسجد
 جب تعمیر ہوتی ہے تو اس کی تعمیر میں کوئی تعمیرات کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے لیکن یہ لحاظ سی
 حد تک رکھا جاتا ہے جس حد تک یہ مسجد کی مسجدیت پر اثر انداز نہ ہو۔ یہ بھی نہیں ہوتا کہ اگر کوئی
 تجربات مسجد کے تہہ رُخ بنانے کے خلاف ہیں تو قبلہ ہی بدل دیا جائے اور مسجد کی جگہ کوئی

مند رہا کلیسا ہی تعمیر کر دیا جائے۔

اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ فقہ کی اصل اہمیت تو شریعت کے نقطہ نظر سے
 ہے لیکن اس کا ایک پہلو تاریخی بھی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس کی جو کچھ اہمیت ہے، اس تاریخی ہی
 ہے اور سیوطی کی تاریخ الحلفاء اور سرخسی کی مبسوط میں کوئی فرق ہی نہیں رہا۔ فقہ کا تدریجی
 ارتقاء ہمیں یہ ضرور بتاتا ہے کہ کس کس طرح کے محرکات اور عوامل نے ذہنوں کو شریعت پر
 تدبیر کرنے کے لیے اکسایا ہے اور ماہرین شریعت نے ہر دور میں اٹھنے والے مسائل کا کس خوبی
 کے ساتھ حل تلاش کیا ہے۔ یہ بات بالکل مختلف ہے اس بات سے جو ارکان کمیشن نے فرمائی
 ہے کہ فقہی ذخیرہ کی جو کچھ اہمیت ہے اس تاریخ کے نقطہ نظر سے ہے۔ تاریخ کی کوئی کتاب
 ہمارے لیے حجت نہیں ہے لیکن فقہ کی ایک کتاب ہر اس شخص کے لیے حجت ہے جو اپنے
 اجتہاد میں اس کو صحیح سمجھتا ہے اور ایک عالم کے لیے تو دین کے ساتھ وابستہ رہنے کی اس کے سوا
 کوئی شکل ہی نہیں ہے کہ وہ ان کتابوں پر اعتماد کرے اور زندگی کے مسائل میں ان پر کاربند ہو۔
 اگر وہ ان کو محض تاریخ کی حیثیت سے کر اپنے تجربات کی روشنی میں فقہ تیار کرنے کی کوشش
 کرے گا تو خلا ہی جانے یہ تجربہ اس کو کس کھڈ میں گرائے۔ آج کے تجربات تو یہ ہیں کہ مرد اور
 عورت کے آنا وانا اختلاط میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ اس کے بغیر قوموں کی ترقی ناممکن ہے
 زنا بالرضا میں کوئی فحاحت نہیں ہے، یہ محض ایک معصومانہ تفریح ہے۔ شراب، حوا، سود،
 اور سینما سب زندگی کی ناگزیر ضرورتیں ہیں۔ اب ان چیزوں کو زندگی سے خارج کرنے کی کوشش
 کرنا سوسائٹی کو رجعت کے غار میں دھکیلتا ہے۔ ان تجربات کے پیچھے پیچھے کون کہہ سکتا ہے
 کہ کہاں تک جانا پڑے۔

ممکن ہے کسی صاحب کو یہ خوش گمانی ہو کہ یہ سب باتیں تو اس شریعت میں شامل ہیں

جس کی نسبت ان حضرات کا یہ اقرار ہے کہ اس میں یہ کوئی تغیر و تبدل نہیں کرنا چاہیے۔ یہ عرض کرنا ہوں کہ لائٹ ایسا ہی ہوتا اور یہ حضرات متعین طوطہ پر یہ مان لینے کہ فلاں فلاں چیزیں ان کے نزدیک شریعت ہیں لیکن میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ یہ اپنی خواہشات کے سوا کسی چیز کو بھی شریعت نہیں مانتے۔ مذہب، قرآن، حدیث اور فقہ کے متعلق ان حضرات کے جو نظریات و تصورات ہیں وہ اپنے پچھلے صفحات میں معلوم کر لیے ہیں۔ اب ان کے بعد کوئی چیز باقی رہ گئی ہے جس کو یہ شریعت مانتے ہیں لیکن اگر کسی کو ان کی نسبت اب بھی حسن ظن ہے تو آگے کے مباحث یہ اچھی طرح واضح کر دیں گے کہ اپنی خواہشات کے سوا یہ کسی چیز کو بھی شریعت ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اجتہاد کی نئی تعریف

کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اجتہاد کی ضرورت پر پہلے ایک لمبی بحث کی ہے، پھر اجتہاد کی نئی تعریف کر کے اپنے کچھ نئے اصول اجتہاد قائم کئے ہیں۔ اجتہاد کی اس نئی تعریف اور ان نئے اصولوں کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اپنی سفارشات میں کمیشن نے جو فقہی اقدام اٹھایا ہے اس کو اس وقت تک جائز اور معقول ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا جب تک اجتہاد کی نئی تعریف کر کے اس کی روشنی میں اجتہاد کے کچھ نئے اصول استخراج نہ کیے جاتے۔ ہمارا ایک جتنا بھی فقہی ذخیرہ ہے وہ تمام تراجم اجتہاد کے ان پرانے اصولوں پر تیار ہوا ہے جو ہماری معمولی کی کتابوں میں بیان ہوئے ہیں۔ اب اگر کوئی نئی فقہ بنانی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ پرانے اصول کام نہیں دے سکیں گے اس کے لیے لازماً نئے اصول فقہ ایجاد کرنے پڑیں گے۔

میں کمیشن کی سفارشات پر بحث کرنے سے پہلے اس جدید اصول فقہ کا بھی جائزہ لینا چاہتا ہوں، کیونکہ اس کا جائزہ لیے بغیر سفارشات کی اصل قدر و قیمت واضح نہ ہو سکے گی۔ کمیشن نے جہاں تک اجتہاد کی ضرورت پر بحث کی ہے مجھے اس ضرورت سے انکار نہیں ہے۔ اس وجہ سے میں اس پر کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ اس سلسلہ میں مجھے اگر اراکان کمیشن سے شکایت ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ یہ حضرات تکلفی ذہن رکھنے کے مدھی ہونے کے

باوجود اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے کوئی تخلیقی نوعیت کا استدلال نہ پیش کر سکے، ایک آیت نقل کی ہے تو وہ بالکل بے محل۔ دو حدیثیں نقل کی ہیں تو وہ ضعیف۔ ایک صحیح حدیث نقل بھی کی ہے، تو وہ بالکل بے موقع۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کا تواتر اعتماد صحیحی محضانی کی کتاب فلسفۃ التشریع فی الاسلام کے اردو ترجمے پر رہا ہے حالانکہ اس باب میں نہ آیات کی کمی تھی نہ احادیث کی اور نہ نقلی اور عقلی دلائل کی۔ تاہم میں اس بحث کو زیادہ کر دینا نہیں چاہتا۔ میں خود اپنے دلائل کی بنا پر اس بات کا قائل ہوں کہ اجتہاد کی ضرورت ہے، یہ ضرورت ہمیشہ رہی ہے اور رہتی دنیا تک رہے گی۔ البتہ ان حضرات نے اجتہاد کی جوئی تعریف کی ہے اور اس کے جوئے اصول قائم کیے ہیں مجھے ان سے اختلاف ہے اس وجہ سے ان پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

اجتہاد کی تعریف اور اس کے شرائط | اجتہاد کی تعریف علامہ اقبال مرحوم کے حوالہ سے کمیشن نے یہ فرمائی ہے:-

”لفظ اجتہاد کے لغوی معنی کو شش کرنے کے میں اور اسلامی قانون کی اصطلاح میں اس کا مفہوم کسی قانونی مسئلہ پر آزادانہ رائے قائم کرنا ہے۔“ (گزٹ آف پاکستان ۱۹۵۱ء)

اس اجتہاد کے لیے ان حضرات کے نزدیک علم دین میں کسی خاص مہارت یا عربی زبان کی کسی خاص قابلیت کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہر شخص کو جو کسی قسم کا بھی علم رکھتا ہے، حق حاصل ہے کہ وہ اجتہاد کرے، ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اسلام میں پاپائیت نہیں ہے، اس نے پادریوں اور عوام کو الگ الگ تعیم کر کے پادریوں کو کچھ خاص امتیازی حقوق نہیں دیے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

”حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک عام عورت بھی لبا اوقات خود ان سے بہتر فیصلے

دیتی ہے، اگر وہ علم کے ساتھ بات کرتی ہے تو وہ اپنا ایک الیاسی استعمال کرتی ہے جو اسلام کی رو سے اسے حاصل ہے۔“ (گزٹ آف پاکستان ۱۹۵۱ء)

کمیشن کے نزدیک تمام ائمہ و مجتہدین کے متفق علیہ اجتہادات کے خلاف بھی اجتہاد کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ عملاً کمیشن نے ایسا کیا بھی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ان ائمہ میں سے کوئی صاحب بھی معصوم نہیں تھے، اور یہ کہ جس طرح سائنس میں کسی دور کے تمام مفسرین کا کسی بات پر اتفاق بھی اس بات کی صحت کی دلیل نہیں بن سکتا، اسی طرح قانون کی تاریخ میں بھی کسی خاص دور کے تمام مجتہدین کا کسی امر پر اجماع اس کی صحت و صداقت کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

”اور بعض معاملات میں کمیشن نے قرآن اور سنت کے اصل احکام کو بعد کے فقہاء کے اجتہادات پر ترجیح دی ہے، قطع نظر اس سے کہ ان کے اتفاق یا اختلاف کا درجہ کیا ہے، کیونکہ ان میں سے کسی نے بھی اپنے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے جس طرح سائنس میں ہے اسی طرح قانون کی تاریخ میں بھی یہ بات ہے کہ بعض اوقات کسی خاص دور کے تمام مجتہدین کا کسی بات پر اجماع بھی اس کی صحت و صداقت کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔“ (جلد ۱۳)

اجتہاد کی بحث میں کمیشن نے اسی طرح کے جوابہر دیر سے بکھیرے تو بہت ہیں لیکن میں طوالت سے بچنے کے لیے صرف مذکورہ بالا چند نکات ہی پر اپنی بحث کو مرکوز کرنا چاہتا ہوں۔

اسلامی اصطلاح میں اگر اجتہاد کے معنی کسی قانونی مسئلہ پر آزادانہ اظہار خیال

یا آزادانہ رائے قائم کرنے ہی کے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عام قانون سازی اور اسلامی اصول فقہ کے اجتہاد میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ بس الفاظ کا فرق ہے۔ مسلمانوں نے اپنی قانون سازی کا نام اجتہاد رکھ چھوڑا ہے، دوسرے ای منہوم کو اپنی اپنی زبانوں اور اپنی بولیوں میں کسی اور طرح تعبیر کرتے ہیں۔ حقیقت کے اعتبار سے دیکھیے تو سریک کی پارلیمنٹ جب قانون سازی کرتی ہے تو وہ بھی درحقیقت اجتہاد ہی کرتی ہے، برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان جب کسی قانونی مسئلہ پر آزادانہ رائے قائم کرتے ہیں تو وہ بھی اجتہاد ہی فرماتے ہیں اور بھارت کی پارلیمنٹ کے ارکان جب کسی قانونی مسئلہ پر اظہار خیال فرماتے ہیں تو وہ بھی اجتہاد ہی موتا ہے اور یہ سارے ہی اجتہاد گویا اسلامی اجتہاد ہیں کیونکہ یہ سب آزادانہ رائے قائم کرتے ہیں۔

اگر یہ حضرات یہ فرماتے کہ خود ان کے اپنے نزدیک اجتہاد کی تعریف یہ ہے تو ہم کو اس پر زیادہ اعتراض نہ ہوتا لیکن جب وہ اس کو ایک اسلامی اصطلاح مانتے ہوئے اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اجتہاد کا یہ مطلب کسی آیت یا کسی حدیث سے اخذ کیا گیا ہے یا کسی مجتہد اور کسی فقیہ نے یہ بیان کیا ہے؟ علامہ اقبال نے مگر کہیں یہ بات لکھی ہے تو یہ کوئی دلیل نہیں ہوئی کیونکہ یہ اصطلاح علامہ اقبال کی نہیں ہے بلکہ فقہاء اور اصولیوں کی ہے، انہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس اصطلاح کا مطلب بیان کریں اور جو مطلب وہ بیان کریں گے وہی مطلب اس کا ہر ایک کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر کسی کو اجتہاد کی اس تعریف سے اختلاف ہو جو فقہاء اس کی کرتے ہیں تو اس کو چاہیے کہ وہ دلائل کے ساتھ پہلے اس کی تردید کرے اور پھر کتاب سنت کی روشنی میں خود اپنی تعریف پیش کرے، لیکن جو اصطلاح دوسروں کی ہے اس کا مطلب خود وضع کرنا اور

اور اس کو ان کے سرچسپک دنیا کوئی انصاف نہیں ہے۔

میں ہر دور کے ماہرین فقہ و اصول فقہ کی کتابوں کی مراجعت کے بعد یہ عرض کرتا ہوں کہ اجتہاد کے یہ معنی اب تک کسی نے بھی نہیں دیے ہیں۔ افسوس ہے کہ بہت سی کتابوں کے حوالے نقل کرنے میں خواہ مخواہ کی طوالت ہوگئی ورنہ میں ہر دور کی کتابوں کے حوالے یہاں پیش کر دیتا۔ تاہم عام ناظرین کے اطمینان کے لیے چند حوالے پیش کرنا ہوں۔ علامہ آمدی اپنی مشہور کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" میں اجتہاد کی لغوی تعریف کرنے کے بعد اس کی فنی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں :-

"اصولوں کی اصطلاح میں لفظ اجتہاد مخصوص ہے اس انتہائی کوشش کے لیے جو کسی امر شرعی کے بارے میں یہ گمان حاصل کرنے کے لیے صرف کی جائے کہ یہ شرع کے موافق ہے" (ص ۲۱۸ ج ۴)

امام شافعی کی موافقات میں اجتہاد کی یہ تعریف ہے :-

"اجتہاد نام ہے شرعی احکام معلوم کرنے اور ان کو حالات پر تطبیق دینے کے لیے انتہائی کوشش کرنے کا۔" (ص ۸۹ ج ۴)

صحیح محمد صافی کی کتاب "فلسفۃ التشریح فی الاسلام" کمیشن کے نزدیک غالباً مستند مانا جاتا ہے اس سے ہے اس وجہ سے اجتہاد کی جو تعریف اس نے کی ہے وہ بھی سن لیجیے :-

"سنت میں اجتہاد کے معنی پوری پوری کوشش صرف کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں اس سے مراد وہ کوشش صرف کرنا ہے جو احکام کا علم شرعی دلائل سے حاصل کرنے کے لیے کی جائے۔ یعنی دین کے ان سرچشموں سے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، احکام استخراج کرنے کی سعی کرنا۔" (ص ۵۵۱)

دیکھیے، اصل حقیقت کیا ہے اور یہ حضرات کیا بیان کرتے ہیں! کچھ دین کے اہل سرچشموں سے احکام مستنبط کرنا اور کچھ کسی قانونی مسئلہ پر آزادانہ رائے قائم کرنا؟ کیا ان دونوں میں نہ صرف دین کا فرق نہیں ہے بلکہ ان کے کمیشن اگر اجتہاد کی یہ تعریف نہ کریں تو اپنی ان سفارشات کو دین کے اندر کس طرح شامل کر سکتے ہیں جو دین کے مآخذ سے کسی قدر بے نیاز ہیں جیسا کہ امریکی یا بھارتی مجلس قانون ساز کا آزادانہ اجتہاد دین سے دور ہے۔

ارکان کمیشن نے امام مالکؒ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں ایک انسان ہوں کبھی صحیح بات کہتا ہوں اور کبھی غلطی کر جاتا ہوں، میری رائیوں کو کتاب اقتدار و سنت رسول پر جانچ لیا کرو۔ اگر ان کے موافق نہ پاؤ تو ان کو پھینک دو۔ اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ کا قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا کہ نہ میری پیروی کرو نہ مالکؒ کی، نہ شافعیؒ کی اور نہ ثوریؒ کی بلکہ انہی سرچشموں سے احکام مستنبط کرنے کی کوشش کرو جن سے انھوں نے مستنبط کیے۔ کمیشن نے یہ اقوال یہ ثابت کرنے کے لیے پیش کیے ہیں کہ یہ ائمہ اپنے آپ کو معصوم نہیں سمجھتے تھے۔ بلاشبہ ان اقوال سے یہ بات ثابت ہوگئی لیکن کیا انہی اقوال سے یہ حقیقت بھی واضح نہیں ہوتی کہ اجتہاد آزادانہ رائے قائم کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ دین کے اہل سرچشموں سے احکام مستنبط کرنے کا نام ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو امام مالکؒ اپنے اجتہادات کو کتاب سنت کی کسوٹی پر پرکھنے کا کیوں مشورہ دیتے اور امام احمد بن حنبلؒ یہ کہیں فرماتے کہ براہ راست دین کے سرچشموں کی طرف توجہ کرو۔ جو رائے آزادانہ قائم کی گئی ہو اس کو کتاب و سنت پر پرکھنے سے کیا حاصل؟

اب اس سلسلہ کی دوسری بات یہ بھیجیے۔ اس اجتہاد کے جسے ان حضرات کے نزدیک کچھ خاص علم و قابلیت کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ڈبل کو کسی کی طرح روح کو برٹے کا رولانے

کے لیے یہ حضرات ضروری سمجھتے ہیں کہ ہر شخص اجتہاد کرے۔ اپنے اس نظریہ کے ثبوت میں یہ حضرات عمرہ کے زمانہ کی ایک خاتون کا واقعہ پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک معاملہ میں عین منبر پر حضرت عمرؓ کو ٹوک دیا اور حضرت عمرؓ نے ان کے اجتہاد کی تعریف فرمائی۔

اور اگر بدرجہ ادنیٰ اس کے لیے یہ کسی علم کی ضرورت سمجھتے تھے بھی ہیں تو وہ علم بہر حال قرآن و حدیث، یا عربی زبان کا علم نہیں ہے، بلکہ یہ اس علم کو بالکل کافی سمجھتے ہیں جس کے یہ خود حامل ہیں۔ اپنے اس استحقاق کو ثابت کرنے کے لیے ایک بات تو انھوں نے یہ پیش کی ہے کہ اسلام میں پاپائیت نہیں ہے۔ بلکہ یہاں علماء اور عوام ایک ہی سطح پر ہیں اور وہ سراسر کا زمانہ یہ انجام دیا ہے کہ جہاں جہاں کوئی ایسی حدیث نقل کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے جس میں عام یا علماء کا لفظ آیا ہے تو اس کا ترجمہ مسلم اسکالر (MUSLIM SCHOLAR) اور عظیم لوگ (PEOPLE WITH KNOWLEDGE) سے کیا گیا ہے تاکہ حدیث سے یہ بات جو واضح ہوتی ہے کہ اجتہاد علماء ہی کا منصب ہے، ترجمہ کے تصرف سے اس پر پردہ ڈالا جاسکے اور عربی سے بے خبر لوگوں پر یہ دھونس جھائی جاسکے کہ خود حدیث میں بھی اجتہاد کا منصب عام تعلیم یافتہ لوگوں ہی کا بتایا گیا ہے، نہ کہ کتاب و سنت کے حاملوں کا۔

اگر اجتہاد کی یہ تعریف صحیح ہے جو ان حضرات نے پیش کی ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ اس کے لیے نہ کسی خاص علم کی ضرورت ہے نہ کسی خاص طرح کے سیرت و کردار کی، جو شخص بھی کچھ عقل گد سے لگا سکتا ہے اس کا جمہوری حق ہے کہ وہ بے لگانہ اجتہاد کرے۔ لیکن اگر اجتہاد کی تعریف وہ ہے جو اس اصطلاح کے وضع کرنے والوں نے اس کی بیان کی ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اجتہاد کرنے والا دین میں گہری بصیرت رکھتا ہو۔ دین کی بنیادی چیزیں جس زبان میں اس زبان سے اس کو عالمانہ واقفیت ہو، نیز سیرت و کردار کے اعتبار سے وہ اس

لائی ہو کہ لوگ اپنے دین کے معاملہ میں اس پر اعتماد کر سکیں۔ انہی صفات کے انحصار کے لیے قرآن اور حدیث میں علماء کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ درحقیقت ایک صفاتی لقب ہے، کوئی خدائی یا طبقاتی لقب نہیں ہے۔ بدقسمتی سے آج اس لقب سے ایسے بہت سارے لوگ بھی ملقب ہو گئے ہیں جو فی الحقیقت اس لقب کے اہل نہیں ہیں۔ لیکن اس القباس اور گھٹیلے کے باوجود حقیقت اپنی جگہ پر ہے۔ علم و فضل اور سیرت و کردار ایسی چیزیں نہیں ہیں جو ہر کسی میں ہوں۔ ایک صفاتی گروہ کو ایک متفعل طبقہ کی حیثیت میں رکھ کر اس کے خلاف تعصب میں مبتلا ہو جانا اور دوسروں کو بھی اس کے خلاف تعصب کے لیے اکسانا ایک سخت قسم کی تنگ نظری اور تنگ دلی ہے بلکہ اس سے ایک گہرے قسم کا احساس کمتری بھی نمایاں ہوتا ہے۔ ایک منصب جو صفات کی بنا پر حاصل ہوتا ہے اور اکتساب حاصل کیا جاسکتا ہے۔ آپ اسے خود حاصل کر لیجئے کسی کی طاقت نہیں ہے کہ آپ کو اس منصب تک پہنچنے سے روک سکے۔ لیکن یہ عجیب دردناک صورت حال ہے کہ آپ کو اتنا جانتا تو دین اور شریعت کا ایک حرف نہیں لیکن اس میں اجتہاد ضرور فرمائیں گے، کیونکہ دین کسی خاص گروہ کا اجارہ نہیں ہے۔ اگر یہ منطق صحیح مان لی جائے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ ہائی کورٹوں میں جج کے مقدمات کے فیصلے کرنا بھی صرف ماہرین قانون ہی کا حق نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر شخص کو حق ہونا چاہیے کہ وہ مقدمات کے فیصلے لکھے اور قانونی معاملات میں اپنی رائیں منوائے۔ علاج کرنے کا حق بھی صرف طبیوں اور ڈاکٹروں ہی کو نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر شخص کو اجازت دے دینی چاہیے کہ وہ لوگوں کی جانوں کے ساتھ بازی کھیل سکے۔ بہروں اور پولوں کی تعمیر بھی صرف انجینروں ہی کا اجارہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر شخص صحیح طور پر دوا نہیں بھی جوڑ نہ سکتا ہوا اسے بھی حق ہونا چاہیے کہ وہ بہروں اور پولوں کی تعمیر میں اپنی رائیں دے سکے۔ اگر ڈیموکریسی اسی چیز کا نام ہے تو یہ ڈیموکریسی دنیا کے لیے لعنت ہے اور اسلام اس ڈیموکریسی کا روادار نہیں ہے۔

اگر ایک چیز میں دخل دینے کے لیے کسی علمی و فنی قابلیت کی ضرورت ہے تو اس میں ہر شخص رائے دینے کا اہل کس طرح ہو سکتا ہے؟ اگر یہ بات صحیح ہے کہ اجتہاد کے لیے دین میں بصیرت ضروری چیز ہے تو اس شخص کے مجتہد بن کے بیٹھ جانے کے کیا معنی ہیں جسے دین سے سرے سے کوئی مس ہی نہیں؟ اسلام میں پاپائیت تو بے شک نہیں ہے بلکہ اخرا سلام خدا کا دین ہے کوئی باریکچہ اطفال تو نہیں ہے؟

ارکان کمیشن نے عہد فاروقی کی جن خاتون کا حوالہ دیا ہے کہ انھوں نے خود حضرت عمر کو ان کے ایک اجتہاد پر ٹوک دیا اور حضرت عمرؓ نے دھرت ان کی رائے قبول فرمائی بلکہ ان کی تحسین بھی کی انھوں نے اس نظریہ کے تحت اپنی رائے نہیں سننے کی تھی کہ دین میں جمہوریت ہے اور یہاں علماء اور عوام میں اجتہاد کے معاملہ میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے جو رائے مہر کم باندھنے کے بارے میں ظاہر کی تھی وہ ان خاتون کو قرآن کے لفظ و فطوار کے وضع مفہوم کے خلاف نظر آئی، اس کو انھوں نے ظاہر کیا اور حضرت عمرؓ نے ان کی رائے معقول اور منجی برقرآن ہونے کی وجہ سے فوراً قبول کر لی۔

انہی خاتون کی طرح اسلام میں ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی کسی رائے پر قرآن و حدیث سے استدلال کرے اور اس کی معقولیت کی بنا پر اس رائے کو تسلیم کر لے۔ ضرورت جس چیز کی ہے وہ قرآن و حدیث کا علم اور دین کا فہم و شعور ہے۔ یہ کوئی حق نہیں کہتا کہ دین کے معاملات میں کلام کرنے کے لیے کسی خاص درس گاہ کا فاضل ہونا یا کسی مخصوص گروہ سے متعلق ہونا مشروط ہے۔ ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی مشروط نہیں ہے لیکن قرآن کا علم اتنا تو ہونا چاہیے جتنا ان خاتون کو تھا۔ میں نے اس رپورٹ میں ارکان کمیشن کے جو اجتہادات دیکھے ہیں اور جن کو آگے چل کر میں ناظرین کو بھی دکھاؤں گا ان کا موازنہ جب میں ان خاتون کے

اجتہاد سے کرنا ہوں تو میں واضح طور پر محسوس کرتا ہوں کہ ان قانون کا تنہا ظلم قرآن اہل پوسے کمیشن کے مجموعی علم دین سے بھی بدرجہا زیادہ تھا۔

اگرچہ اجتہاد کی صحیح تعریف سامنے آ جانے کے بعد یہ بات خود بخود واضح ہو گئی کہ ایک مجتہد میں کیا صفعتیں ہونی ضروری ہیں۔ لیکن مزید وضاحت کے لیے ہم یہاں اسلامی اصول قانون کے چند مستند ماخذوں کے حوالے بھی پیش کیے دیتے ہیں۔

علامہ آمدی اپنی کتاب میں مجتہد کے لیے دو شرطیں ضروری قرار دیتے ہیں۔

”ایک یہ کہ وہ خدا کے وجود، اس کی صفات، اس کے کمالات کو جانتا اور مانتا ہو۔ اور رسول اور اس کی لائی ہوئی شریعت اور اس کے معجزات کو تسلیم کرتا ہو۔“

”دوسری یہ کہ اسلامی شریعت کے احکام اور ان کے سرچشموں اور ان کے اقسام کا علم ہو۔ جانتا ہو کہ ان کے اثبات کے کیا طریقے ہیں، یہ اپنے مدلولات پر کن کن طریقوں سے دلائل کرتے ہیں۔ ان کے درجات میں کیا اختلاف ہیں، ان میں کن شرائط کا لحاظ ضروری ہے اگر ان میں اختلاف ہو تو ترجیح کے کیا کیا طریقے ہیں، ان سے احکام کس طرح مستنبط کیے جاتے ہیں۔ نیز ان کو لکھنے اور بیان کرنے پر قیاد ہو، ان پر جبراً اعتراضات وارد ہوں ان سے بچ سکتا ہو۔ اس کی مزید تکمیل اس بات سے ہوگی کہ راویوں اور جرح تعدیل کے طریقوں سے یا خبر ہو.... اسباب نزول اور ناسخ و منسوخ سے واقف ہو... اور عربی زبان اور نحو کا علم ہو۔

(الاحکام فی اصول الاحکام ج ۴ ص ۱۱۱)

اہم شرطیں فرماتے ہیں:-

”درجہ اجتہاد اس شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جس میں دو صفعتیں موجود ہوں:-“

ایک یہ کہ وہ شریعت کے مقاصد کا پوری طرح فہم رکھتا ہو، دوسری یہ کہ وہ

اس فہم کی رہنمائی میں شریعت سے مسائل استنباط کرنے پر قادر ہو۔“

(المواقعات ج ۴ ص ۱۱۱)

کمیشن کا سب سے زیادہ مستند ماخذ صحیحی محمد صافی اپنی کتاب فلسفۃ التشریع میں مجتہد کے لیے حسب ذیل صفات ضروری سمجھتا ہے:-

”اجتہاد کرنا ہر شخص کے لیے جائز نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ایک خاص قابلیت

کی ضرورت ہے جس سے مجتہد استدلال و استنباط کے پیش نظر مقصد کا

اہل ہو سکے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ وہ پختہ فکر اور دانشمند ہو، اخلاق حسنہ

سے متصف اور دین کے سرچشموں کا عالم ہو یعنی شرعی دلائل اور ان کے تلاش

کے طریقوں اور ان کے مقلقات، عربی زبان، تفسیر، ایاب نزول، احوال

نوعات، جرح و تعدیل اور ناسخ و منسوخ سے پوری طرح باخبر ہو۔“

(فلسفۃ التشریع ص ۱۵۵)

کیا کمیشن کے ارکان یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اجتہاد کے ان شرائط پر پورے اُتاتے ہیں؟

اب اس سوال کو لیجیے کہ تمام ائمہ کے متفق علیہ مسلک کے خلاف بھی اجتہاد کیا

جاسکتا ہے یا نہیں؟

اس سوال کا ایک پہلو تو عقلی ہے، دوسرا واقعاتی۔ برائے نام اس کے عقلی پہلو کا تعلق

ہے۔ یہ تسلیم کرنا ہوں کہ اہل پہلو سے اس چیز پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ائمہ عقلی سے

مبرا نہیں تھے اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ یہ کسی امر اجتہادی پر متفق ہوں لیکن وہ بات

صحیح نہ ہو، مگر اس کے ساتھ ملحوظ رکھنے کی چیز یہ ہے کہ جو بات عقلاً محال نہ ہو ضروری

نہیں کہ وہ واقعہ کی حیثیت سے مراد بھی ہو۔ علامہ اقبال سے بڑا شاعر ہونا محال نہیں ہے

میاں عبدالرشید صاحب یا ان کی شریک کاریگاری سے کوئی صاحب یہ دعویٰ کرے جیسے کہ ہم ان سے بڑے شاعر ہیں تو یہ سب حضرات مجھے معاف کریں، میں ان کے دعویٰ کو تسلیم نہیں کروں گا کیونکہ ہمارے سامنے ان کا کوئی بھی ایسا شعری یا ادبی کارنامہ نہیں ہے جس کی بنا پر ہم ان کو شعر و ادب پر گفتگو کرنے کا بھی اہل سمجھیں۔ چہ جائیکہ ان کو آئمہ شعر و سخن کا ہمسر مان لیں یا کچھ ان سے بھی اونچا درجہ ان کا تسلیم کر لیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایک مسئلہ جس پر امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ جیسے عالی مقام لوگ متفق ہیں۔ اس کے خلاف دین کے معاملہ میں کوئی شخص میاں عبدالرشید بیگم شاہ نواز اور بیگم شمس النہار کے فتویٰ پر کس طرح اعتماد کر سکتا ہے؟ ایک محتاط مسلمان کے لیے تو ان حضرات پر یہ اعتماد کرنا بھی خصل ہے کہ ان میں سے کسی صاحب کو صحیح طور پر طہارت کے اسلامی آداب بھی معلوم ہیں یا نہیں کجا کہ وہ ان کی نقاہت اور ان کے اجتہاد کے پیچھے دین کے مسئلہ آئمہ کے متفقہ اجتہاد یا ان کے اجماع کو نظر انداز کر دے۔

یہ نہ خیال کیجیے کہ ان آئمہ پر مسلمانوں کا یہ غیر معمولی اعتماد محض کسی اتفاق کا نتیجہ ہے، یا محض تقلید اور قدامت پرستی کا ایک منظر ہے۔ اگر کسی شخص کا یہ خیال ہے تو یہ محض ایک دامن ہے۔ تقلید اور قدامت پرستی سے عوام کے ایک مخصوص طبقہ کے اندر تو ان شخص یا نظریات سے متعلق کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن ساری دنیا اندھ نہیں ہو جاتی۔ اور اگر بالفرض ساری دنیا اندھ ہو جاتی ہے تو میں یہ عرض کروں گا کہ اس طرح کے عالمگیر اندھے پن کو دور کرنے کے لیے وہ روشنی بالکل ناکافی ہے جو اس کمیشن نے دکھائی ہے۔ اس سے بجائے اس کے کہ تاریکی دور ہو اندھیرے میں اور اضافہ ہوگا۔ جو لوگ اس اعتماد کو مسلمانوں کا جو دیکھتے ہیں، ان کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اس عہد کو امام ابن تیمیہؒ جیسا زلزلہ ڈال دینے والا

انسان بھی ہلائے سکا اور شاہ ولی اللہؒ جیسے صاحب فکر اور نقاد کو بھی اس کے ساتھ سازگار کر دیا مڑی، حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو بے تکلف اور بالکل بجا طور پر علم اولین کا حامل اور وارث قرار دیا جاسکتا ہے۔ پھر بتائیے کہ اس کو پر میں میاں عبدالرشید اور خلیفہ صاحب کو کون چھپا ہے کہ آپ کس کجیت کی مولیٰ ہیں۔ درحقیقت ان آئمہ نے اپنے علم، اپنی بصیرت، اپنے تقویٰ اپنی نکتہ رسی، اپنے تجرار دین کے لیے اپنی جان بازیوں اور قربانیوں سے اس امت پر ایک ایسی حجت قائم کر دی ہے کہ کسی مسلمان کے دل میں کبھی یہ دوسوہ بھی نہیں گزرتا کہ ان میں سے کسی نے بھی کبھی ان کے دین کے معاملہ میں کسی سہل انگاری، کسی مہانت یا کسی کمزوری یا دین بازی کا ارتکاب کیا ہوگا۔ آخر ان آئمہ ہدایت کے مقابلے میں مسلمان ان لوگوں پر کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں جن کی زندگیوں یا تودین کے ساتھ استہزا اور تلعب میں گزری ہیں۔ یا کھلم کھلا دین بازی اور فتویٰ فرماتی ہیں۔

ارکان کمیشن کا یہ نظریہ بھی نہایت عجیب ہے کہ جس طرح سائنس میں کسی ایک اور کے تمام سائنس دانوں کا کسی ایک نظریہ پر اتفاق اس کی صحت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اسی طرح مذہب میں بھی کسی ایک بات پر سارے آئمہ کا اتفاق اس کی صحت کی دلیل نہیں ہے۔ اول تو مذہب کا سائنس پر قیاس ایک قیاس مع الفارق ہے۔ سائنس کی بنیاد قیاسات و تجربات پر ہے اور مذہب کی اساس وحی کی یقینیات پر۔ اس وجہ سے سائنس میں تو سہرقت اس بات کا امکان ہے کہ آج آپ ایک چیز کو ثابت مانیں اور کل وہ سب کچھ اٹھائیں اور کل اس چیز کو آپ مرکز مانتے رہے ہیں آج وہ کسی دوسرے مرکز کے تابع ہو جائے۔ لیکن مذہب میں یہ غلطی اگر ہو سکتی ہے تو وحی کی یقینیات میں نہیں بلکہ حالات پر اس کے انطباق میں ہو سکتی ہے اور وہ بھی اس دائرہ میں نہیں جس دائرہ میں انطباق کا یہ کام خود صاحب وحی یعنی پیغمبر نے انجام دے دیا ہے بلکہ

صرف اس دائرہ میں ہو سکتی ہے جہاں یہ کام غیر معصوم انسانوں نے انجام دیا ہے۔

پھر ان غیر معصوم انسانوں کے بھی مختلف درجات ہیں اور انھوں نے دین کو زندگی کے حالات پر منطبق کرنے کی جو کوششیں کی ہیں ان کے بھی مختلف درجے ہیں اور ان درجات کے اختلاف کے لحاظ سے مسلمانوں کا اعتقاد بھی ان پر مختلف درجے کا ہے۔ مثلاً ایک لفظ یا تو وہ ہے جس پر غلط رائے ہیں اپنے دور کے اہل علم و تقویٰ کے مشورہ کے بعد متفق ہو گئے ہیں یہ اسلام میں اجماع کی بہترین قسم ہے اور یہ بجائے خود ایک شرعی حجت ہے۔ اسی طرح ایک لفظ یا تو وہ ہے جس پر ائمہ اربعہ متفق ہو گئے ہیں۔ یہ اگرچہ درجہ میں پہلی قسم کے اجماع کے برابر نہیں ہے تاہم چونکہ یہ امت میں حجت الامت ان ائمہ پر متفق ہو گئی ہے اور ہر دور کے اہل علم و تقویٰ ان کی دینی بصیرت، ان کے تجربہ ان کے مرتبہ اجتہاد اور ان کے تسلک بالکتاب السنہ کو تسلیم کرتے آئے ہیں اور ان کے دائرہ سے باہر نکلنے کی کوششیں شکلی ہی سے کسی نے کی ہے، اس وجہ سے ان ائمہ کے کسی اجماع کو محض اس دلیل کی بنا پر رد نہیں کیا جاسکتا کہ یہ معصوم نہیں تھے۔ یہ معصوم تو بے شک نہیں تھے، لیکن ان کے معصوم نہ ہونے کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ کسی امر پر ان کا اتفاق بھی دین میں کوئی حجت نہیں ہے۔

میں حیران ہوں کہ میاں عبدالرشید صاحب جیسے قانون دان نے بھی سائنس اور قانون کے فرق کو سمجھنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ سائنس میں نظائری کوئی بھی حیثیت نہیں ہے لیکن قانون میں بالخصوص اس قانون میں جس کی سند میاں عبدالرشید صاحب نے حاصل کی ہے، ساری بنیاد ہی نظائری پر ہے۔ اگر اس کے اندر سے نظائر کو نکال دیجئے یا ان کو ناقابل اعتماد قرار دے دیجیے تو پھر کچھ باقی ہی نہیں رہتا۔ کیا میاں عبدالرشید صاحب فرما سکتے ہیں کہ انگریزی قانون میں بھی اعلیٰ عدالتوں کے نظائر کی وہی حیثیت ہے جو حیثیت وہ اسلامی قانون کے نظائر کو دینا چاہتے ہیں؟

اس سلسلہ میں کمیشن نے ایک بات قابل لحاظ لکھی ہے۔ مسلمانوں کی تقلید اور جمود پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ عباسیوں کے دور کے خاتمہ پر جب تاتاریوں نے تمام علمی مراکز تباہ کر دیئے، کتب خانے جلادئے اور لوگوں کے اندر آزادانہ فکر و اجتہاد کے حوصلے سرد کر دیئے تو اسلامی قانون کو دوسرے درجے کے مخترعین (INNOVATORS) اور ناپائیداروں کی دستبرد سے بچانے کے لیے مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ غلط اجتہاد کے بجائے کچھ ائمہ کی تقلید کی جائے کیونکہ غلط اور ناقص اجتہاد سے وہ ذہنی انتشار تو پہلے ہی کچھ کم نہ تھا اور زیادہ بڑھ جاتا۔

یہ تاریخی تجزیہ اگرچہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے لیکن اگر کمیشن کے ناظران اس تجزیہ کو اور تقلید کے حوازی کی اس دلیل کو کچھ وزن دیتے ہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں وہ کونسا مبارک انقلاب آگیا کہ ارکان کمیشن اجتہاد کا دروازہ چوپٹ کھول دینے کے بجائے جتا ب جتا ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ بگیا تے بھی باب اجتہاد پر بغاوت کر دی ہے۔ عباسیوں کے دور کے خاتمہ پر تاتاریوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر جو تباہی آئی، میرے نزدیک وہ تباہی اتنی وسیع اثر نہیں رکھتی، جتنی وہ تباہی وسیع الاثر تھی جو سلطنت مغلیہ کے خاتمہ پر انگریزوں کے ہاتھوں نازل ہوئی۔ تاتاریوں کی لائی ہوئی تباہی سے مدرسے اور کتب خانے جتنے بھی برباد ہوئے ہوں اس سے انکار نہیں لیکن اذہان و قلوب پر انھوں نے وہ اثر نہیں ڈالا جو انگریزوں نے ڈالا۔ انگریزوں نے ہمارے کتب خانے جلائے تو ہمیں ملین اس نے ہمارے ذہنوں کو اس طرح مسموم کر دیا کہ ہم خود اپنے کتب خانوں کو دہی کے ڈھیر خیال کرنے لگے۔ اس نے ہمارے مدرسے ڈھائے تو ہمیں ملین دین اور دینی تعلیم سے اس نے ہمیں اس طرح متنفر اور بیزار کر دیا کہ ہم دینی مدرسوں میں داخل ہونے کو عار سمجھنے لگے۔ اس نے ہمارے فکر و نظر کی آزادی کو بالکل سلب تو نہیں کیا لیکن ہمیں مرعوب اس طرح کر دیا

کہ ہمارے لیے فکر و عمل کے ہر میدان میں وہی معیار حق بن گیا۔ پھر ایسے حالات میں کیا یہ مصلحت نہیں ہے کہ اسلامی قانون کو دوسرے نہیں بلکہ تیسرے درجہ کے مختصر بین کے اجتہاد اسکے محفوظ رکھا جائے اور جو انتشار ذہنوں میں پہلے سے پیدا ہو چکا ہے اس کے بڑھانے کے مزید اسباب فراہم نہ کیے جائیں ؟

میں ایک مرتبہ پھر اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہاں تک اجتہاد کی ضرورت کا تعلق ہے جس میں اس چیز کا اس سے زیادہ شدت سے قائل ہوں جتنی شدت سے اس کے قائل ارکان کمیشن ہیں۔ لیکن آخر اہلیت و صلاحیت تو اس کے لیے ایک شرط ضروری ہے۔ ہر مدعی منصب اجتہاد کا حقدار تو نہیں بن سکتا ؟

اجتہاد کے نئے اصول

اجتہاد کی اس تعریف کے بعد کمیشن نے کچھ نئے اصول اجتہاد ایجاد کیے ہیں۔ اب ہم ان پر بحث کریں گے۔

معاشرتی انصاف اور حکومت | کمیشن نے اپنے اجتہادات کے سلسلہ میں ایک اصول یہ بیان کیا ہے کہ "حکومت معاشرتی انصاف کی نگہبان (CUSTODIAN) ہے۔"

اس اصول کا ذکر اگر کسی فلسفہ سیاست کی کتاب یا کسی حکومت کے دستور میں ایک سہما اصول کی حیثیت سے آتا تو ہم اس سے تعرض نہ کرتے۔ لیکن اس رپورٹ میں اس کا سوا کہ جس پہلو سے آیا ہے وہ قابل غور ہے۔ اس رپورٹ میں اس کا ذکر اس حیثیت سے آیا ہے کہ معاشرتی معاملات سے متعلق قانون سازی کرتے وقت حکومت پاکستان کو از روئے شرع کیا پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ کمیشن کا مشورہ یہ ہے کہ اس طرح کے معاملات میں حکومت کو تمام قیدوں اور پابندیوں سے آزاد ہو کر قانون سازی کے لیے اقدام کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسی نظریہ کے تحت اس رپورٹ میں ایک سے زیادہ مقامات میں حکومت کو اس بات پر ابھارا گیا ہے کہ وہ کسی چیز کی پروا کیے بغیر کمیشن کی پیش کردہ سفارشات قبول کرے اور ان کے مطابق قانون بنا دے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

”قیمتی سے اس وقت مسلم معاشرہ زندگی کے ایسے اہم معاملات میں (اشارہ ہے نکاح، طلاق، تعدد ازدواج وغیرہ کے ان معاملات کی طرف جن کے بارے میں کمیشن نے سفارشات پیش کی ہیں) بالکل غیر ذمہ دار ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے حکومت کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کے لیے اقدام کرے جو ان پھیلی ہوئی برائیوں کو روک سکیں۔ (گزٹ آف پاکستان، ص ۱۲۲)

اس اصول سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حکومت سوشل سبسٹنس کی کسٹوڈین ہوتی ہے۔ اور ہماری حکومت بھی سوشل سبسٹنس کی کسٹوڈین ہے۔ لیکن اس کے کسٹوڈین ہونے کے سرگزیر معنی نہیں ہیں کہ وہ اس اصول کی آڑ لے کر سن مانے قوانین بنانے شروع کرے اور مذہب اور دستور کی چیز کی بھی پروا نہ کرے۔ ہمارے ملک کے دستور میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کا صرف وہی تصور جائز اور معقول تسلیم کیا گیا ہے جو اسلام نے دیا ہے۔ چنانچہ دستور کے دیباچہ (PREAMBLE) میں یہ الفاظ ثبت ہیں:-

”جس میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کو جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے۔ (ENUNCIATED BY ISLAM) پوری طرح ملحوظ رکھا جائے گا۔“

علاوہ ازیں سوشل سبسٹنس کا جس حد تک تعلق پرسنل لاس ہے اس پر ایک مزید قیام ہمارا دستور یہ بھی عائد کرتا ہے کہ کسی فرقہ کے پرسنل لا میں حکومت کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گی ایک صحیح قسم کی اسلامی حکومت کا اصلی منصب درحقیقت ہے بھی یہی کہ وہ دنیا میں خدا کے قانون کو جاری کرنے والی ہوتی ہے، وہ کسی حالت میں بھی اپنی طرف سے کوئی نیا دین ایجاد کرنے کی جرات نہیں کرتی۔ اس حقیقت کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ ہونے کے بعد

اپنے پہلے ہی خطبہ میں اسی طرح ظاہر فرمایا کہ ”میں خدا کی مشرعت کا نافذ کرنے والا ہوں۔ اپنی جانب سے کوئی نئی چیز ایجاد کرنے والا نہیں ہوں۔“

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ قانون سازی کا یہ فارمولا کمیشن نے کس کی خاطر ایجاد فرمایا ہے؟ جہاں تک پاکستان کی حکومت کا تعلق ہے وہ تو اس اصول سے وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتی، جو ارکان کمیشن کے پیش نظر ہے اس سے اگر فائدہ اٹھا سکتی ہے تو ایک کلیت پسند ریاست (TOTALITARIAN STATE) فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ لیکن پاکستان کی ریاست ایک پابند آئین ریاست ہے جس کی قانون سازی کی آزادی پر اس کے دستور نے بہت سی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور جب تک وہ ایک مطلق العنان حکومت بن جانے پر آمادہ نہ ہو جائے اس کے لیے ان پابندیوں کو توڑنا ممکن نہیں ہے۔

صرف پاکستان ہی کی حکومت کی کیا تخصیص ہے۔ اس وقت تو دنیا میں کوئی حکومت بھی ایسی نہیں ہے جو سوشل سبسٹنس کی نگہبانی کے بہانے معاشرتی زندگی کے لیے سن مانے قوانین بنانے کی جبارت کا ارتکاب کرے۔ اس قسم کی جبارت ماضی قریب میں اگر کسی حکومت نے کی ہے تو وہ روس کی اشتراکی حکومت ہے۔ اس نے عین اسی اصول کی رہنمائی میں اپنے قوانین ازدواج ۱۹۱۸ء و ۱۹۲۶ء میں اپنے ملک کے سابق معاشرتی و ازدواجی قوانین بیک گردش قلم نیپٹ کر کے رکھ دیئے تھے۔ تمام بچے ریاست کی ملکیت اور مذہب کے تخت بانڈھے ہوئے تمام نکاح کا اعدم قرار دیے گئے تھے، خاندان کے نظام کو مرعایہ داری کی آخری کمین گاہ بھیرا دیا گیا، طلاق دینے کے لیے میاں اور بیوی دونوں کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ جب چاہیں ایک کا رڈ کے ذریعہ سے اپنے ارادہ طلاق سے ایک دوسرے کو مطلع کر دیں۔ حرامی اور جائز اولاد کے حقوق قانوناً یکساں کر دیئے گئے۔ ان تمام کارناموں کے لیے دلیل یہ تھی کہ حکومت سوشل

حبش کی کٹودین ہے۔ لیکن جب اس کے نتائج سامنے آئے اور حرامی بچے فوج و فوج سرکوں پر باد لے کتوں کی طرح پھرنے لگے اور عورتوں کی عزت کتوں کے برابر بھی باقی نہیں رہ گئی۔ تب سوشل حبش کے ان نگہبانوں کو پریش آیا اور پھر کچھ تو انین بول کیے گئے۔ کیا ارکانِ کمیشن یہ اصول قانون سازی پیش کر کے اپنی حکومت کو بھی یہی راہ دکھانے کے خواہشمند ہیں؟

الگ الگ دور الگ الگ احکام | کمیشن کا دوسرا اصول اجتہاد یہ ہے کہ اسلامی احکام میں اس امر کو مد نظر رکھ کر فرق کیا جانا چاہیے کہ کون سے احکام سبک لیے اور برابر قائم رہنے والے ہیں اور کون سے احکام ایک خاص طرز کی سوسائٹی ایک مخصوص دور اور ایک خاص علاقہ سے تعلق رکھنے والے ہیں (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۹)

مطلب اس ارشادِ گرامی کا یہ ہے کہ اسلام کے سائے ہی احکام نہ تو سبک لیے جی رہے نہ یہ ہر سوسائٹی، ہر دور اور ہر علاقہ کے لیے عام ہیں۔ اس کے بہت سے احکام عربوں کے لیے خاص ہیں، ان کو ساری دنیا پر لاد دینا بالکل غلط ہے۔ بہت سے قوانین ایک خاص طرز کی سوسائٹی کے لیے وضع ہوئے تھے، ان کو ہر طرح کی سوسائٹی کے سر منہ دینا حماقت ہے، بہت سے احکام ایک خاص دور سے تعلق رکھتے تھے، ان کو اس دور کے گزر جانے کے بعد بھی گھسیٹے چلے جانا محض دنیا فوسیت اور حماقت ہے۔

اس زری اصولِ اجتہاد کے لیے کسی قرآنی آیت یا کسی حدیث یا کسی ایسے دلیلے اہم و معتد کے قول کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے جس پر آپ کوئی حرف گیری کر سکیں، بلکہ فقیہ اعظم مبنی سن (TENNYSON) صاحب کا حوالہ دیا گیا ہے جن کا دین میں حجت قاطع ہونا ان لوگوں کی رائے میں گویا سب کے نزدیک ستم ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ ہر پرانا نظام نئے کے لیے جگہ خالی کر کے تبدیل ہو جاتا ہے اور خدا اپنے آپ کو بے شمار

شکلوں میں ظاہر کرتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو ایک عمدہ سے عمدہ نظام بھی دنیا کو تباہ کر کے رکھ دے؟

اول تو اس ذہنیت کو ملاحظہ فرمائیے کہ جن لوگوں کو پیغمبر کے ارشادات صحابہ کے اقوال اور ائمہ کے اجتہادات میں مجالِ کلام نظر آتی ہے وہ لوگ کس اطمینان سے ایک انگریز شاعر کے ایک قول کا ایک اصولِ اجتہاد کے ماخذ کی حیثیت سے حوالہ دیتے ہیں۔ واقعی انسان کی جب عقل ماری جاتی ہے تو وہ لعل و گہر کو پھینکتا اور مینگنیوں سے دہن بھرنا ہے۔

اولیٰ تو میں ان حضرات سے یہ پوچھتا ہوں کہ اگر قرآن و حدیث کے احکام اور پیغمبر کے ارشادات ہر سوسائٹی، ہر دور اور ہر علاقہ کے لیے سند اور حجت نہیں ہیں تو مبنی سن صاحب کی بکواس ہر سوسائٹی، ہر دور اور ہر ملک و ملت کے لیے کس طرح حجت بن گئی ہے کہ آپ اس کو دلیل بنا کر سائے دین پر خط نسخ پھیر دینا چاہتے ہیں؟ دوسرے یہ کہ مبنی سن کہنا تو یہ ہے کہ ہر قدیم خواہ وہ کتنا ہی مقدس و محترم ہو، اس دنیا کے لیے لعنت ہے اور ہر جدید خواہ وہ کتنی ہی بڑی لعنت ہے، اس دنیا کے لیے نہ صرف رحمت اور برکت ہے بلکہ اسی کے ذریعہ سے اس دنیا میں خدا کی مرضی پوری ہوتی ہے، اگر اس کو اختیار نہ کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس عہد کے لیے خدا نے جس نظام کو اپنا دین قرار دیا ہے، ہم اس سے بغاوت کر رہے ہیں۔ اس بات کو اگر اور زیادہ واضح الفاظ میں کہا جائے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ جس زمانہ میں قرآن اور اسلام کا نظام قائم ہوا تھا اس زمانہ میں خدا کی مرضیات کا مظہر اسلام رہا ہو تو رہا ہو لیکن اب اس عہد میں خدا کی مرضیات کا اگر مظہر ہے تو وہی نظام ہے جو اس وقت تہذیب مغربی کے نام سے موجود ہے۔ آج خدا ہی بھیس میں جلوہ گر ہوا ہے اور اگر اس کو اختیار نہ کیا جائے بلکہ اسلام کو اس کی جگہ لانے کی کوشش کی گئی تو یہ دنیا تباہ ہو کر

رہ جائے گی۔ تیسرے یہ کہ اگر آپ حضرات کا ایمان ٹینیسن ہی پر ہے تو وہ تو قدیم میں سے کسی انتخاب کا مشورہ نہیں دیتا۔ بلکہ پوسے قدیم کو تباہ دینے کا مشورہ دیتا ہے۔ پھر آپ اسلام میں سے انتخاب کرنے کہاں چلے ہیں کہ اس کے جو احکام ہمہ گیر ہیں وہ تو لے لیے جائیں اور جو احکام وقت، سوسائٹی اور خاص عرب کے ساتھ مخصوص تھے وہ چھوڑ دیے جائیں۔ اگر آپ حضرات نے ٹینیسن کو سنا کر خود اس کے مشورہ کے بھی خلاف کیا، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس طرح آپ کو اسلام کی کوئی بات تحریف کے بغیر پسند نہیں آتی اسی طرح ٹینیسن پر بھی آپ حضرات کا ایمان ادھورا ہی ہے۔ یکسو ہو کر نہ آپ حضرات امت محمدیہ میں رہنا چاہتے ہیں اور نہ امت ٹینیسن میں۔

ابھی، اب اس بحث کو چھوڑیے کہ ٹینیسن کیا کہتا ہے۔ آئیے اس امر پر غور کیجیے کہ ارکان کمیشن جو کچھ فرماتے ہیں اس کی عملی شکل کیا ہوگی اور اگر ان کے ذہن مشورہ پر عمل کیا جائے تو اس کے نتائج کس شکل میں ظاہر ہوں گے؟ یہ حضرات اسلام کے ان احکام میں جو سب کے لیے ہیں اور ان احکام میں جو علاقائی اور وقتی ہیں امتیاز کر کے اول الذکر کو باقی رکھنے اور موخر الذکر کو منسوخ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ہم جی کڑا کر کے تھوڑی دیر کے لیے یہ مشورہ قبول کیے لیجئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کام کسے گا کون؟ جہاں تک خدا اور رسول کا تعلق ہے انھوں نے تو عمومی احکام اور علاقائی اور وقتی احکام میں امتیاز کرنے کے لیے کوئی کسوٹی ہمیں دی نہیں ہے۔ بلکہ سارے دین کو ایک ہی حیثیت میں دیا ہے اور سب کے لیے دیا ہے، اور قیامت تک کے لیے دیا ہے جو احکام وقتی تھے وہ اپنی مدت پوری کر چکے کے بعد منسوخ ہو گئے۔ اور یہ کام خود خدا اور رسول نے کر دیا۔ اب ہمیں کوئی اختیار نہیں ہے کہ ہم شریعت کے احکام میں وقتی اور مستقل کی تفریق کریں اور کچھ کو باقی رکھیں اور کچھ کو منسوخ

کر دیں۔ اگر خدا اور رسول کی بنائی ہوئی کوئی کسوٹی جس سے یہ کام انجام پاسکے، ارکان کمیشن کے علم میں ہے تو انھیں چاہیے تھا کہ وہ اپنے اس مشورہ بلکہ اس اجتہاد کے ساتھ اس کو پیش کرتے تاکہ کام کرنے والوں کو آسانی ہوتی۔ لیکن اگر کسی وجہ سے وہ اس رپورٹ میں اس کو پیش نہیں کر سکے ہیں تو ہماری التجا ہے کہ وہ اب بھی اس کو پیش فرمادیں تاکہ یہ کارِ عظیم بہولت اور ہلکی نزاع و اختلاف کے انجام پاسکے۔ ورنہ قدم قدم پر جھگڑا ہوگا۔ ایک شخص ایک حکم کو وقتی اور علاقائی قرار دے گا دوسرا اسی کو ابدی اور سب کے لیے عام بتائے گا۔ اس طرح ایک ایک حکم پر علاقائی و غیر علاقائی کی جنگ برپا ہو جائے گی۔

خرض کیجئے ایک شخص حج اور قربانی کے متعلق یہ دعویٰ کر بیٹھتا ہے کہ یہ بعض ایک علاقائی وعیت کا حکم تھا۔ عربوں کو اپنے اب وجد کے طریق عبادت سے دلچسپی تھی اس وجہ سے اسلام نے اس کو اپنا لیا، ساری دنیا کے لیے اور وہ بھی ہمیشہ ہمیش کے لیے اس کے عام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس کے اس دعوئے کا کیا جواب ہوگا؟ اسی طرح ایک دوسرا اٹھتا ہے، وہ کہتا ہے کہ تحصیل زکوٰۃ کا طریقہ ایک خاص طرز کی سوسائٹی اور ایک مخصوص طرز کے معاشی اور تمدنی ماحول میں تو نبھ سکتا تھا لیکن اب جب کہ شخص تحصیل محاصل کے نہایت اعلیٰ طریقے جاری ہو چکے ہیں، اسی فرسودہ طریقے پر جے رہنا بجلی کے فمقوں کے آگے مٹی کا دیا جلانے کے ہم معنی ہے۔ ایک اور شخص کھڑا ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ اسلام نے شادی بیاہ اور نکاح و طلاق سے متعلق جو قوانین بنائے تھے وہ صرف ایک مخصوص طرز کی سوسائٹی ہی میں چل سکے تھے اب تہذیب و تمدن کے اس دور میں انہی قوانین پر اصرار کرتے چلے جانا معاشرہ کو جامد بنادینا ہے۔ کوئی صاحبِ اہم قسم کا سوال اسلام کے کاروباری احکام یا زنا اور چوری کی تعزیرات یا اسلام کے اخلاقی احکام و اُدا کے متعلق اٹھا دیتے ہیں کہ یہ ساری

باتیں عرب کی غیر ترقی یافتہ سوسائٹی کے لیے خاص تھیں، یہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہیں تو کوئی شخص ان کا کیا بگاڑے گا۔ اسی طرح تو خدا کا سارا دین ہی ہوا سو جائے گا۔ کچھ ایک خاص قسم کی سوسائٹی کے ساتھ مخصوص ہونے کے سبب سے منسوخ ہو جائے گا۔ کچھ وقتی قرار دے دیا جائے گا اور کچھ علائقی۔

ارکان کمیشن نے اپنے اس اصول اجتہاد کی تائید میں مثنیٰ سن کے مذکورہ بالا قول کے علاوہ غلامی سے متعلق اسلامی احکام کا حوالہ بھی دیا ہے کہ دیکھو ایک زمانہ میں یہ احکام تھے محترم و مقدس تھے۔ لیکن جب زمانہ کی ترقی سے سوسائٹی تبدیل ہو گئی تو یہ سارے احکام بے معنی ہو کر رہ گئے۔ اب نہ غلام میں نہ غلامی اور نہ غلامی سے متعلق اسلامی احکام کمیشن کا مطلب یہ ہے کہ اسی طرح سوسائٹی تبدیل ہو جانے کے بعد اگر شادی، بیاہ، طلاق، نکاح حدود و تعزیرات اور سہ اور سود سے متعلق اسلام کے احکام بھی منسوخ ہو جائیں تو اس پر تعجب کیوں ہو۔

یہ مثال کمیشن نے پیش کرنے کو تو پیش کر دی لیکن اس کے ایک پہلو پر اس نے غور نہیں فرمایا کہ غلامی سے متعلق احکام جو بیکار ہوئے ہیں تو وہ اس وجہ سے ہوئے ہیں کہ غلام، جن کے تحفظ کے لیے یہ قوانین ضروری تھے، اب موجود نہیں رہے۔ اسی طرح اگر دنیا میں چوری باقی نہ رہے تو اسلام کو اس بات پر سرگز اصرار نہیں ہوگا کہ چوری کی سزا قطعید لازمًا جاری کی جائے یا زنا دنیا میں باقی نہ رہے، تو بھی اس کی سزا کسی نہ کسی پر ضروری نافذ کی جاتی رہے، یا تعدد ازدواج کی کوئی شخص، عائلی، قومی ضرورت نہ بھی باقی رہے تو بھی تعدد ازدواج کی اجازت پر قانوناً عمل کرایا جائے۔ قوانین تو ضرورت کے لیے بنے ہیں۔ اگر ضرورت باقی نہیں رہی ہے تو اس ضرورت کے لیے اسلام نے جو قانون بنایا ہے اس کے استعمال پر اسلام کو خواہ مخواہ اصرار

کیوں ہوگا؟ لیکن اگر ایک ضرورت موجود ہے اور پہلے سے کہیں بڑھ چڑھ کر موجود ہے تو محض اس دلیل کی بنا پر کہ حالات تبدیل ہو چکے ہیں وہ قانون کیوں غیر ضروری ہو جائے گا جو اس ضرورت کے لیے اسلام نے بنایا ہے؟ غلامی اگر دنیا سے ناپید ہو چکی ہے تو یہ ایک مبارک بات ہوئی اب کسی کو بھی اصرار نہیں ہے کہ اس سے متعلق قوانین استعمال کرنے کے لیے ضرور کچھ غلام جیا کیے جائیں لیکن یہ عجیب صورت حال ہے کہ چوری تو موجود ہے لیکن چوری کی اسلامی سزا پر آپ لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ زنا گلی گلی میں ہو رہا ہے لیکن زنا کی سزا کے تصور سے آپ حضرات کو وحشت ہو رہی ہے۔ سود کا کاروبار گونا گوں شکلوں میں ہو رہا ہے، لیکن اس کے متعلق اسلام نے جو قانون بنایا ہے وہ منسوخ ہو جانا چاہیے۔ تعدد ازدواج کی ضرورت کا ہر پہلو موجود ہے یہاں تک کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے زنا کے دروازے چوٹ کھول دیئے گئے۔ بے اول و عورتوں نے ذواتین و ذوات کی ذلیل حیثیت اختیار کر رکھی ہے، مغرب اور مغرب زدہ سوسائٹی میں دشتاؤں کا ایک باقاعدہ نظام قائم ہونا چاہا رہا ہے لیکن تعدد ازدواج پر فتنہ لگنی چاہیے کیونکہ زمانہ بدل چکا ہے۔

آخر زمانہ کس اعتبار سے بدل چکا ہے؟ کیا اس اعتبار سے کہ اسلام نے جن برائیوں کے سد باب کے لیے یہ قوانین بنائے تھے وہ برائیاں اب عرب جاہلیت کے مقابلے میں بزرگنا بڑھ گئی ہیں، یا اس اعتبار سے کہ اب وہ ناپید ہو چکی ہیں، یا اس اعتبار سے بدل گیا ہے کہ یہ ساری برائیاں اب تہذیب کے سانچہ میں ڈھل چکی ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو اسلام اس تہذیب کی خاطر اپنے قوانین منسوخ کرنے کے بجائے آپ کی اس تہذیب پر لعنت بھیجا ہے اور اپنے پیروؤں کو حکم دیا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی تعاون کرنے کے بجائے اس کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اپنا پورا زور استعمال کریں۔

جو قطعی اور غیر مشروط طور پر ممنوع نہیں وہ جائز ہے | کمیشن نے اپنا ایک تفتق علیہ اصول اجتہاد یہ بتایا ہے کہ جو چیز قطعی اور غیر مشروط طور پر ایک واضح حکم کے ذریعہ سے ممنوع نہیں ہے وہ جائز ہے اگر افراد یا قوم کی بہبود اس کا تقاضا کر رہی ہے (ص ۱۲۰۴)

اس اصول کو اسلامی اصول فقہ کا ایک بنیادی اصول بتایا گیا ہے، حالانکہ اسلامی اصول فقہ سے اس کو کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ہمارے اصول فقہ میں جو بات کہی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ ”اشیاء میں اصل شے اباحت ہے، حرمت ان پر شریعت کے حکم کے تحت وارد ہوتی ہے“ اب یہ وارد ہونا ایک واضح حکم کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے کسی نص کے اشارہ یا انتضا کے تحت بھی ہو سکتا ہے، اور امثال و نظائر پر قیاس کے واسطے سے بھی ہو سکتا ہے کسی چیز کی حرمت یا کراہت بیان کرنے کا طریق قرآن یا حدیث میں صرف یہی نہیں ہے کہ ”ہم نے فلاں چیز غیر مشروط اور قطعی طور پر حرام کر دی بلکہ اس کے بہت سے اسلوب میں کبھی ایک شے کا مثبت پہلو بیان کر دیا جاتا ہے جس سے یہ بات آپ کے آپ نکل آتی ہے کہ اس کا خدا اسلام میں حرام ہے کبھی ایک حکم خاص بیان ہوتا ہے اور سیاق کلام دہل جاتا ہے کہ اس طرح کی ساری ہی چیزیں حرام ہیں۔ کہیں کسی چیز کی تحریم یا کراہت کے حکم کے ساتھ اس کی حرمت یا کراہت کی علت وضع کر دی جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جن چیزوں کے اندر یہ علت پائی جائے گی وہ ساری چیزیں حرام یا مکروہ ہیں۔ ارکان کمیشن نے جو کثرت اصول اجتہاد اصول فقہ کی طرف منسوب کیا ہے اگر

اس کو صحیح مان لیا جائے تو پھر تو اس اجتہاد کی بحث میں پڑنا ہی لا حاصل ہو گیا جس کی ضرورت ثابت کرنے پر ان حضرات نے اتنی قوت صرف فرمائی ہے پھر تو ان چند چیزوں کے سوا جن کو قطعی اور غیر مشروط طور پر کسی واضح حکم کے ذریعہ سے حرام ٹھہرا دیا گیا ہے باقی

ساری چیزیں جائز اور حلال و طیب ہو گئیں۔ اس کے بعد کسی اجتہاد و قیاس کی کھکھڑ میں پڑنے کی ضرورت ہی کب باقی رہی؟ اور یہ ”غیر مشروط“ کی قید لگا دینے کے بعد تو اکثر پچھلی حرمتیں بھی سوا ہو گئیں۔ کیونکہ بہت سی حرمتیں ایسی ہیں جن کے ساتھ کوئی نہ کوئی شرط بھی لگی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں موجودہ زمانہ کے جتنے نئے بھی ہیں انہوں نے ایک نیا سا پتھر اختیار کر لیا ہے۔ آپ ان میں سے ہر چیز کی نسبت یہ فرما سکتے ہیں کہ خاص ان کی حرمت اسلام میں ”وضع اور غیر مشروط طور پر“ کہاں وارد ہے؟ بلکہ اس سے بڑھ کر اس اصول کے تحت آپ کے یہ سوال بھی معقول ہو جائیں گے کہ یہ کہاں ”وضع اور قطعی طور پر“ لکھا ہوا ہے کہ عورت قوام نہیں ہو سکتی، یا عورت خود طلاق دینے کی مجاز نہیں ہے، یا عورت جہرا کر نے اور نفقہ دینے کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد بھی مرد پر شوہرانہ اختیارات نہیں حاصل کر سکتی؟ واقعہ یہ ہے کہ ان چیزوں میں سے کسی چیز کا حرام ہونا ”قطعی طور پر“ تو قرآن یا حدیث میں کہیں بھی نہیں لکھا ہوا ہے۔ یہ ساری چیزیں اگر اسلام میں ممنوع ہیں تو اس وجہ سے ہیں کہ ان نے جو اصول قائم کر دیے ہیں، یہ باتیں ان کے خلاف ہیں۔ اس وجہ سے تو نہیں ہیں کہ ”قطعی اور غیر مشروط طور پر“ وضع الفاظ میں ان کی ممانعت وارد ہے۔ اپنے اس نادرا اصول کے بعد تو یہ حضرات اگر کل کو یہ چیلنج کر دیں کہ قطعی اور غیر مشروط طور پر کہاں وضع الفاظ میں اس بات کی ممانعت وارد ہے کہ ایک عورت بیک وقت چار مردوں سے نکاح نہیں کر سکتی تو مجھے اندیشہ ہے کہ غریب مولوی ان لوگوں کو شاید ہی کوئی مسکت جواب دے سکیں۔

جدید اسوۂ حسنہ کی پیروی کی دعوت | کمیشن کا چوتھا اصول اجتہاد یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے معاشرتی اور اقتصادی سانچے ایک قلم تبدیل ہو چکے ہیں اس وجہ سے اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جس فقہ کو سامنے رکھ کر معاشرتی اور اقتصادی مسائل حل کیے گئے تھے وہ نقشہ

اب کام نہیں دے سکتا۔ اب اس نئے نقشے کی پیروی کرنی چاہیے جو زمانہ ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے۔

ارشاد مولا ہے :-

”موجودہ زمانہ کا معاشرتی اور اقتصادی نقشہ (PATTERN) اسلام

کی ابتدائی صدیوں کے مقابل میں قابلِ لحاظ حد تک تبدیل ہو چکا ہے (صفحہ ۱۲۹)

اس حقیقت سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ موجودہ زمانہ کے اقتصادی اور معاشرتی سانچے اسلام کی ابتدائی صدیوں کے مقابل میں تبدیل ہو چکے ہیں اور یہ تبدیلی ہم سے اس بات کا مطالبہ کر رہی ہے کہ ہمیں نئے پیدا شدہ مسائل کا اسلام کی روشنی میں حل ڈھونڈنا چاہیے۔ اگر اس تبدیلی کی غیورانہ سے کمیشن کا مقصد وقت کے اس مطالبہ کی طرف اشارہ کرنا ہے تو اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر کمیشن کا مطلب یہ ہے کہ ان تبدیلیوں میں سے ہر تبدیلی مستحسن ہے اور اس تبدیلی کے مطابق نہ صرف ہمیں بلکہ اسلام کو بھی تبدیل ہو جانا چاہیے تو کمیشن کے اس خیال کے ساتھ کوئی معقول آدمی اتفاق نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ ان میں سے بہت سی تبدیلیاں ایسی ہیں جو زمانہ جاہلیت کی طرف رجعت کے حکم میں داخل ہیں اور ان کو نہ صرف یہ کہ ہمیں قبول نہیں کرنا ہے بلکہ اگر ہم اسلام کو جاہلیت پر غالب دیکھنے کے خواہشمند ہیں تو ہمیں ان کی اصلاح کرنی ہے۔ کمیشن اگر زمانہ کی ہر تبدیلی کو مبالغہ سمجھتا ہے اور اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنا سب کچھ بدلی لینے کا مشورہ دیتا ہے تو ہمارے نزدیک یہ مشورہ نہایت غلط ہے۔

اس اصولِ اجتہاد کے قائم کر لینے کے بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر بار بار کمیشن نے یہ دعویٰ کرنے کی غلطی کیوں کی ہے کہ ہم جو کچھ فرما رہے ہیں وہ عین کتابِ سنت کی روشنی میں فرما رہے ہیں

پھر تو نہ اسلام ایک دینِ کامل رہا اور نہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ دائمی رہا۔ اگر یہ کہا گیا تھا کہ اَلْيَوْمَ اَتَمَمْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ (اب میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا) یا یہ فرمایا گیا تھا کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (تمہارے لیے رسول کے طریقہ کے اندر نمونہ ہے) تو یہ ساری باتیں دقیق اور زمانی ہوئیں۔ پیروی کے لیے صلی اسوۂ زمانہ کا اسوہ ہوا۔ پھر کتابِ سنت کا حوالہ دینے کا تکلف کیوں کیا گیا۔ پھر تو یہی ایک فیصلہ کن بات کہنے کی تھی کہ موجودہ زمانہ کے معاشرتی اور اقتصادی سانچے اور یہ اس لیے قرآن و حدیث کو اب بالائے طاق رکھو، یہ دنیاوی چیزیں اب چلنے والی نہیں ہیں۔

ارکانِ کمیشن نے اس اصول کے بیان کرنے میں غایت اجمال سے کام لیا ہے۔ یہ واضح نہیں فرمایا کہ موجودہ زمانہ کی وہ کیا اقتصادی و معاشرتی برکتیں اور محنتیں ہیں جن کے ظہور میں آجانے کے بعد اب اسلام کی بساطِ لپیٹ دینی چاہیے۔ اس وقت کے سماجی و اقتصادی نظام کی بہترین نمائندگی تو انگریز اور امریکن یا روسی کر رہے ہیں۔ آخر ان کی وہ کونسی چیز ہے جس کے اتباع اور جس کے لیے اسلام کو چھوڑنے کی ارکانِ کمیشن دلت دے رہے ہیں۔ ہم تو ان دونوں ہی کے معاشرتی اور اقتصادی نظام پر یکساں معنت بھیجتے ہیں اور ان کو دنیا کے لیے عذاب سمجھتے ہیں۔ اگر ارکانِ کمیشن ان کے ماسوا کوئی اور معاشرتی اور اقتصادی نظام اپنے ذہن میں رکھتے ہیں تو براہِ کرم ارشاد ہو کہ وہ کیا ہے۔ کیونکہ اس رپورٹ کے اندر تو مغرب کی اندھی اور احمقانہ تقلید کے سوا ہمیں کوئی چیز بھی نظر نہیں آتی۔

نئی سنت اور نئی فقہ کی ضرورت | کمیشن کا پانچواں اصول اجتہاد یہ ہے کہ :-

”انسانی روابط کے بنیادی اصول جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں وہ تو ہمیشہ قائم رہیں گے لیکن ان کے نفاذ اور تطبیق کا طریق حالات کے تغیر کے ساتھ ساتھ

بدلتے رہنا چاہیے۔ (ص ۱۲۲۹)

اول تو ارکانِ کمیشن کو یہ متعین فرما دینا چاہیے کہ انسانی روابط کے بنیادی اصول ہیں کیا اس رپورٹ سے توجہ کچھ واضح ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی بنیادی نہیں ہے جو ان حضرات کے نزدیک تبدیل نہ ہو سکتی ہو۔ لیکن اگر کوئی چیز ایسی ہے تو اس کو واضح اور متعین ہو جانا چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی اصول کو خود قرآن نے یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہ کے متفقہ عمل نے زندگی کے حالات پر تطبیق دے کر دیا ہو تو اس کی بابت کیا ارشاد ہے؟ اگر باقی رہنا چاہیے یا نہیں؟ ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن کریم صرف چند اصولوں کی مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس نے اصولوں کو زندگی پر منطبق بھی کیا ہے اور سنت تو نام ہی ہے زندگی کے معاملات پر قرآنی اصولوں کی تطبیق کا۔ یہی خدمت اپنے اپنے دور میں ائمہ اسلام نے انجام دی ہے۔ کیا ان سب کے باسے میں ارکانِ کمیشن کا مشورہ یہ ہے کہ ان کو یکسر نظر انداز کر کے قرآن کے اصولوں کو از سر نو زندگی کے حالات پر تطبیق دی جائے اور نئی سنت اور نئی فقہ مرتب کی جائے؟

اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت | ان کا چھٹا اصول اجتہاد یہ ہے کہ:-

”شادی، طلاق، ولایت، تولیت اور وراثت کے متعلق قوانین و ضوابط،

خاندانی تعلقات میں تحفظ و استحکام اور کمزوروں کی مدد کے نقطہ نظر سے از سر نو

ترتیب و اصلاح (OVER HAULING) کے محتاج ہیں؟ (ص ۱۲۲۹)

یہ احکام و قوانین ظاہر ہے کہ صرف ائمہ اور فقہاء کے اجتہادات ہی سے تعلق نہیں رکھتے

ہیں۔ بلکہ ان کا بہت سرحصہ خود قرآن میں بیان ہوا ہے۔ پھر ان کی تفصیلات احادیث

میں مذکور ہوئی ہیں۔ اس کے ایک حصہ پر خلفائے راشدین کا اجماع ہے اور کچھ حصہ ہے جو فقہاء

کے اجتہادات سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر ہر سب نظر ثانی اور جانچ پڑتال کے محتاج ہیں تو اس کے

صاف معنی یہ ہیں کہ ان میں سے جو بدلے ہوئے حالات کے اندر اختیار کیے جانے کے لائق ہیں وہ تو رکھ لیے جائیں اور جو ان حضرات کے خیال میں فرسودہ اور کہنہ ہو چکے ہیں وہ ترک کر کے ان کی جگہ پر نئے قوانین وضع کر لیے جائیں۔

خاندان کے استحکام و تحفظ اور کمزوروں کی مہمزدی کا توجہ دو ان حضرات کے اندر

اٹھا ہے اس کی حقیقت آگے چل کر واضح ہوگی۔ جب آپ کے سامنے وہ تجاویز اور سفارشات

آئیں گی جو ان حضرات نے مذکورہ بالا مقصد سامنے رکھ کر مرتب کی ہیں، میں آگے ان پر نصیرہ

کر کے دکھاؤں گا کہ اگر یہ سفارشات اور تجاویز منظور ہو جائیں تو صبح و شام میں ہمارے معاشرے کے

ایک ایک خاندان کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی اور ہمارے اندر بھی میاں کا بیوی کے ساتھ

اور بچوں کا والدین کے ساتھ دبی رسمی اور بے روح تعلق رہ جائے گا جو آج انگلستان اور

امریکہ کے اکثر گھروں میں نظر آتا ہے اور جس پر دہاں کے نجدہ لوگ ماتم کر رہے ہیں۔ نیز کمزوروں

کی جس مہمزدی کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی حقیقت بھی واضح کروں گا کہ ان کی تجویز کردہ اصلاحات

سے۔ اگر وہ عمل میں آجائیں، طبقہ نسواں کی کیا گت بنے گی؟

عہد طفولیت کے احکام کی زرمیم و اصلاح | ہمارے ان نئے ائمہ کا ساتواں اصول اجتہاد

یہ ہے کہ اسلام نے بعض چیزوں کی اجازت شروع شروع میں اس لیے دے دی تھی کہ اس وقت

انسانی سوسائٹی اپنے دورِ طفولیت میں تھی۔ اب اس دورِ کمال و ترقی میں اگر یہ دیکھا جا رہا ہے

کہ لوگ ان اجازتوں سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں تو ضروری ہے کہ ان پر ایسی پابندیاں عائد

کردی جائیں جن سے اس سوء استعمال کے نقصانات کو زیادہ سے زیادہ حد تک کم کیا جاسکے

ارشاد ہوتا ہے:-

”خاص قسم کی معاشرتی بیماریاں خاص قسم کے علاج کی محتاج ہوتی ہیں۔ اگر اسلام نے

ایک چیز کا حکم نہیں، بلکہ صرف اس کی اجازت اس لیے دی تھی کہ انسانی سوسائٹی
منور اپنے دور طفولیت میں تھی اور یہ اجازت غلط طور پر استعمال ہو رہی ہے
تو اس اجازت پر مزید پابندیاں اور شرطیں عائد کی جاسکتی ہیں تاکہ موجودہ خرابیوں
کو ممکن حد تک کم کیا جاسکے (ص ۱۲۲۹)

ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ اسلام کی اجازتیں ہوں یا احکام یہ سب فطرت پر مبنی ہیں،
فَطَرَةً اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا اور انسان کی فطرت ہر دور ہر زمانہ اور ہر ملک میں یکساں
رہنی چاہیے۔ اس وجہ سے اسلام کے احکام ہر ملک اور ہر زمانے کے لیے یکساں طور پر انسان کی
فطرت کے مطابق ہیں۔ جو چیزیں زمانہ اور آب و ہوا سے متاثر ہوا کرتی ہیں، ان کے بارے میں اسلام
نے کوئی حکم ہی نہیں دیا ہے تاکہ لوگ اپنے اپنے حالات کے تحت ان میں جو دیوبہ پسند کریں اختیار
کر سکیں۔ لیکن ہمارے یہ نئے آئینہ میں یہ خبر دیتے ہیں کہ اسلام کے احکام میں ایسے احکام بھی ہیں جو
محض انسانی سوسائٹی کے دور طفولیت کے تقاضوں کے تحت دیئے گئے تھے۔ اگر یہ بات صحیح
ہے اور ان حضرات کا یہ فرمانا بھی صحیح ہے کہ اس طرح کے احکام یا اجازتوں میں اس دور ترقی و کمال
میں ترمیم و اصلاح سوجھانی چاہیے تو گوارا دے رہے ہیں کہ صرف ترمیم و اصلاح یا مزید پابندیوں کے
اضافہ ہی پر کیوں اکتفا کیجیے۔ اس طرح کے احکام اور اجازتوں کو سرے سے ختم ہی کیوں نہ کر دیجئے
آخر چینی کے اس بھگوا کو اس جوانی کے زمانہ میں پہنے رہنا کہاں کی دانائی ہے؟ اس میں چونکہ لگا لگا
اور پینچ تان کر کہاں تک اس تنگ کو اپنے جسم پر راست لانے کی کوشش کریں گے؟ فرض کیجیے
کچھ دنوں تک آپ ہی سے اپنی سر ڈھانکتے ہیں کامیاب بھی ہو گئے تو اس سے کیا بنتا ہے آخر
ایک نہ ایک دن تو یہ آپ کو اتار کر نیا جامہ زیب تن کرنا ہی پڑے گا؟ پھر جو کام بہت سی ذلتوں اور
سوامیوں کے بعد کل آپ کو کرنا ہی ہے تو آج ہی اس سے کیوں نہ فائدہ نہ ہو جائے؟

پھر اس سوال پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر اسلام کا ظہور ایک ایسے عہد میں ہوا جب کہ
انسانی سوسائٹی اپنے دور طفولیت میں تھی اور اس سبب اس نے بعض طفلانہ احکام دے دیے
تو آخر بعض ہی احکام کیوں طفلانہ دیئے؟ عقل و حکمت کا تقاضا تو یہ ہے کہ سارے ہی احکام
سوسائٹی کے سن و سال اور اس کے عقلی معیار کے مطابق دیئے گئے ہوں۔ بچوں کو تو کوئی سبق بھی
ایسا نہیں پڑھایا جاتا جو بڑھوں کے لیے موزوں ہو۔ ان کو تو سارے ہی سبق دی پڑھائے جاتے
ہیں جو ان کے ذہن اور ان کی استعداد کے مطابق ہوں۔ اس دلیل کو بنیاد بنا کر اگر ایک شخص یہ کہے
کہ پورا اسلام انسانی سوسائٹی کے عہد طفولیت کا دین ہے اور اس تہذیب و ترقی کے زمانہ میں
اس کی کوئی چیز بھی اختیار کیے جانے کے لائق نہیں ہے تو آپ کا یہ نظریہ تسلیم کر لینے کے بعد اس کا
کیا جواب دیا جاسکتا ہے؟ پھر تو روزہ اور نماز سے لے کر حدود و تعزیرات اور بیوع و معاملات
تک سب اس کی زد میں آجائیں گے اور ایک ایک چیز کے متعلق بڑی آسانی کے ساتھ یہ کہا جا
سکے گا کہ اسلام نے سوسائٹی کے ابتدائی ایسٹج میں یہ حکم دے دیا تھا اب اس میں ترمیم و اصلاح ضرور
ہے۔ کیا ارکانِ کمیشن اپنے اس اصولِ اجتہاد سے اسی فتنہ کا درد اذہ کھونا چاہتے ہیں؟
اس اصول کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ العباد یا خدا خدا نے اپنے آخری نبی کو
بالکل قبل از وقت بھیج دیا جب کہ وہ اس دنیا کو کسی ایسے دین کی تعلیم نہیں دے سکے تھے، جو
رہتی دنیا تک قائم نہ سکے اس لیے یا تو ایک خاتم الانبیاء اب اس دور کمال و ترقی میں آئے یا
کم از کم نبوت کا سلسلہ (خواہ وہ ظہور یا مردی، قائم و دائم رہے) کیا ارکانِ کمیشن اپنے قیمتی
اجتہاد کے اس قیمتی نتیجہ کو تسلیم کرتے ہیں؟

یہ فقہانیت بھی قابلِ داد ہے کہ اگر لوگ کسی حکم یا کسی اجازت کی شرطیں پوری نہیں کر رہے
ہیں تو ان پر مزید شرطیں عائد کر دی جائیں۔ ایک طرف تو یہ حضرات پرانے فقہاء پر یہ اعتراض

کر رہے ہیں کہ انہوں نے دین کو اصرار و اغلال کا ایک مجموعہ بنا دیا ہے۔ دوسری طرف خود اپنا رویہ یہ ہے کہ لوگ چونکہ چار شرطیں پوری نہیں کر رہے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے چار کا اہد اضافہ کر دیا ہے۔ اگر ان مزید چار کے اضافے کے بعد بھی وہی اٹھیں باقی رہے تو پھر کیا ہوگا، کیا مزید شرطوں کا اضافہ ہوگا، یا سیرے سے اجازت ہی منسوخ کر دی جائے گی۔ انخوان و انشور بخ اس پہلو پر بھی کیوں غور نہیں فرمایا کہ جب انسانی سوسائٹی اپنے دور طفولیت میں تھی تو اسلامی حکومت نے کس طرح لوگوں سے یہ شرطیں پوری کرائیں، کیا زمانہ کی ترقی اور اس کے کمال کی یہی دلیل ہے کہ ہند طفولیت کی حکومت تو لوگوں کو آزادی سے کرمی حدود کی پابند رکھ سکتی تھی اور کسی کی مجال نہ تھی کہ ان حدود سے آگے بچھے ہو سکے۔ لیکن دور کمال میں جب تک انسان کے جوڑ جوڑ کو باندھ نہ لیا جائے اس وقت تک اس سے دو بیویوں کے درمیان عدل بھی نہیں کر لیا جاسکتا ہے اگر اس دور کمال کی یہی رکتیں ہیں تو خدا ان لوگوں کی عقلوں پر رحم فرمائے جو اسلام کے عہد اول کی سوسائٹی کو تو ہند طفولیت کی سوسائٹی کہتے ہیں اور اپنی سوسائٹی کو دو شباب کی سوسائٹی سمجھتے ہیں ہمارے نزدیک تو اس شباب سے وہ بچپن ہی اچھا تھا۔ جب انسان میں آناجوش گوش تو تھا کہ آزاد رہ کر بھی وہ حدود کی پابندی کرتا تھا۔

استحسان | آٹھواں اصول اجتہاد جس پر ان حضرات نے اعتماد فرمایا ہے وہ استحسان ہے، اس میں شبہ نہیں کہ استحسان کے اصول کو فقہائے حنفیہ مانتے ہیں، لیکن ان کے نزدیک اس کا مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے جو ان حضرات نے اس کا سمجھا ہے۔ یہ حضرات تو اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ علوم کے مفاد کو سامنے رکھ کر جو جی میں آئے قانون بنا دالے جائیں، یہ استحسان ہوگا اور یہی فقہائے حنفیہ کے نزدیک ایک نہایت مغیر اصول اجتہاد ہے جس سے ماضی میں بے شمار قانونی مشکلیں حل کی گئی ہیں، لیکن میں وضع کرنا چاہتا ہوں کہ اس کا یہ مفہوم مرکز نہیں ہے۔ استحسان

کے متعلق یہ امر سب کے نزدیک مسلم ہے کہ جس دائرہ میں کتاب سنت یا اجماع کی کوئی رہنمائی موجود ہے وہاں اس کا کوئی کام نہیں ہے، وہاں جو کچھ کتاب سنت یا اجماع سے ثابت ہے وہی عمل ہے۔ اگر حنفیہ اس اصول کو کوئی اہمیت دیتے ہیں تو اس دائرہ میں دیتے ہیں جس دائرہ میں سارا مدار بحث قیاس یا عرف و مصلحت پر ہے۔ اس دائرہ میں بعض مرتبہ ایک خاص صورت حال یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک بات قیاس کی رو سے تو قوی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مصلحت اور ضرورت کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں حنفیہ کا ایک گروہ اس بات کو جائز سمجھتا ہے کہ قیاس کو چھوڑ کر مصلحت کو اختیار کر لیا جائے اور اس کو وہ استحسان کہتے ہیں۔

اہم شافعی اس استحسان کے بڑے مخالف ہیں۔ وہ اس کو ایک مستقل تشریح قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا حق اشتراک رسول کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر استحسان کا یہ مفہوم سمجھا جائے کہ محض مصلحت اور مفاد کو سامنے رکھ کر جس کے جو جی میں آئے قانون بنا دالے جیسا کہ ارکان کمیشن کہتے ہیں، یا ایک صحیح قیاس پر بھی محض مفاد کو ترجیح دے دی جائے تو یہ ایک مستقل تشریح ہوتی جس کے جیسے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے اسلام میں مصلحت یا ضرورت کا ایک خاص دائرہ ہے، جس میں اسلام نے سیرے سے دخل ہی نہیں دیا ہے۔ اس دائرہ میں مصلحت اور ضرورت ہی ہمارے رہنما ہیں۔ اس وجہ سے اس میں ہم انفرادی یا اجتماعی طور پر مصالح اور حالات کی رعایت کے ساتھ جو کچھ کریں گے اگر وہ دین اور اخلاق کے کسی اصول کے منافی نہیں ہے تو وہی حق ہے اور اسی میں خدا کی رضا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حنفیہ اس دائرہ میں استحسان کے قائل ہیں اور اس کو مالکیہ مصالح مرسد سے تعبیر کرتے ہیں۔

کمیشن کی سفارشات

کمیشن کی سفارشات جن عقاید و نظریات اور اجتہاد کے جن اصولوں پر مبنی ہیں، پچھلی دو فصلوں میں ان پر تفصیل کے ساتھ بحث کر چکا ہوں۔ اب میں اہل سفارشات پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

سفارشات پر تبصرہ کرنے میں عموماً دو باتیں میں پیش نظر رکھوں گا۔ ایک یہ کہ کمیشن نے ہر سفارش کی تائید میں جو دلائل دیئے ہیں ان پر تنقید کر کے ان کی حقیقت واضح کر دوں کہ کچھ وزن رکھتے ہیں یا نہیں؟ دوسری یہ کہ ہمارے معاشرہ کو عموماً اور طبقہ فساد کو خصوصاً ان سفارشات سے جو نقصانات پہنچیں گے ان کو وضع کر دوں تاکہ جو حضرات اس رپورٹ کو آسانی پرکت سمجھ رہے ہیں اور جو بیگناہات اس کو جلدی سے جلدی قانون کی شکل دے دیتے کے لیے مطالبہ کر رہی ہیں وہ اس کے نتائج پر اچھی طرح غور کر لیں۔

نکاح کی رجسٹری | کمیشن نے سفارش کی ہے کہ از روئے قانون ہر نکاح کی رجسٹری لازمی قرار دے دی جائے۔ رجسٹری کا طریقہ کمیشن نے اپنے نزدیک آسان سمجھ کر یہ تجویز کیا ہے کہ حکومت کی طرف سے ایک معیاری نکاح نامہ مرتب کر کے شائع کر دیا جائے۔ یہ نکاح نامہ ہر ڈاک خانہ سے معمولی قیمت (اکٹھ آنے) پر مل سکے۔ یہ سہ دقتی ہو۔ نکاح کے وقت نکاح خواں اور

گواہوں کی موجودگی میں اس کی خانہ پری کر کے اس کی ایک کاپی دولہا کے حوالہ کر دی جائے، دوسری کاپی دولہن یا اس کے ولی کو دے دی جائے اور تیسری کاپی نکاح خواں جو ابی رجسٹری کے ذریعے سے حلقہ کے تحصیلدار کے پاس بھیج دے تحصیلدار کے پاس ایک مخصوص رجسٹر ہوگا جس میں ان تمام نکاح ناموں کی نقلیں محفوظ رہیں گی۔ نکاح نامہ کی ایک نقل تحصیلدار کو بھیجنا نکاح خواں کا کام ہوگا اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرے گا تو اس کو پانچ سو روپے جرمانہ تک کی سزا دی جاسکے گی۔

کمیشن نے نکاح کی رجسٹری لازمی کرنے کے حق میں جو دلیلیں دی ہیں اب ان کا جائزہ لیجئے پہلی دلیل — جو ایک شرعی دلیل کی حیثیت سے لائی گئی ہے یہ ہے کہ قرآن مجید میں مالی لین دین کے سلسلہ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اِذَا تَدَايَعْتُمْ بَيْنَ يَدَيْنِ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاَكْتَبُوْهُ دَاۤرُ قَمٰٓتِیٰ مِّنْ دِیْنِ اِلٰہِیْكَ مَتَّعِیْۤتَہٗ تِلْكَ اِلَیْہِ كَرُوْا اُوْسَی كُوْلُكُہٗ یَا كُرُوْا كَمِیْشَن نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ جب مالی لین دین کے معاملہ میں تحریر کا حکم دیا گیا ہے تو نکاح کا معاملہ تو مالی لین دین کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے؟ نیز اس میں دین مہر کی شمولیت بھی ہے جس کے بعد تو اس کے ایک واقعی مالی معاملہ ہونے میں کسی کوئی شک نہیں رہ جاتا۔ پھر اس میں تحریر کیوں نہ ضروری قرار دے دی جائے۔

اگرچہ کمیشن کے اس استدلال پر یہ سوال پہلی نظر ہی میں سامنے آ جاتا ہے کہ حجب مالی لین دین کے معاملات میں اللہ تعالیٰ نے تحریر کا حکم دیا ہے تو کمیشن کے بقول جو معاملہ اس سے زیادہ اہمیت رکھنے والا ہے آخر اس میں بھی خود اللہ تعالیٰ نے تحریر کا حکم کیوں نہ دے دیا؟ کیا کمیشن کی رائے میں اللہ میاں سے یہ چوک ہو گئی؟ لیکن میں اس سوال کو نہیں چھیڑنا چاہتا۔ اگر کمیشن کا استدلال اس آیت سے صرف اسی حد تک ہوتا کہ مالی لین دین کی طرح نکاح سے متعلق ضروری کارروائیوں کا بھی قید تحریر میں آ جانا ایک سنسن فعل ہے، تو خواہ یہ استدلال صحیح ہوتا یا غلط، مجھے تحریر کو مستحسن

مان لینے میں تامل نہ ہوتا۔ لیکن وہ اس آیت پر بنا رکھے ہوئے نکاح کی رجسٹری کو لازم قرار دیتا ہے۔ رجسٹری نہ کرنے کو حرم مستلزم سزا بھڑاتا ہے اور اس کا منشا یہ بھی ہے کہ جس نکاح کی رجسٹری نہ ہو اس کے وقوع کی دوسری شہادتیں موجود ہونے کے باوجود عدالتیں اس کو جائز تسلیم نہ کریں حالانکہ اس آیت میں خود مالی لین دین کے لیے بھی جس سے یہ براہ راست متعلق ہے، تحریر کو لازم نہیں کیا گیا ہے، نہ عدم تحریر کو مستلزم سزا بھڑایا گیا ہے اور نہ یہی فیصلہ کیا گیا ہے کہ جس قرض کی لکھا پڑھی نہ ہو وہ مکرر سے قرض تسلیم ہی نہ کیا جائے گا۔ آیت کا اصل حکم تو زیادہ سے زیادہ بس اسی حد تک جاتا ہے کہ مالی معاملات کا تحریر میں آجانا اچھا ہے تاکہ شہادت قائم ہونے میں آسانی ہو اور شک کی گنجائش نہ رہے۔ اس پر قیاس کر کے کمیشن میں اتنی ہی سفارش نکاح کے معاملہ میں بھی کر سکتا تھا، اور اگر وہ ایسا کرنا تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا، بلکہ میں خود اس کو مختلف پہلوؤں سے مفید چیز سمجھتا ہوں۔ اعتراض اگر ہے تو نکاح کی رجسٹری لازمی قرار دینے پر ہے۔ اس چیز کا ثبوت مذکورہ بالا آیت سے مہیا نہیں ہوتا۔ کیونکہ مذکورہ آیت میں جس تحریر کا حکم ہے وہ خود ہی لازمی نہیں ہے تو اس پر قیاس کر کے اپنے جو حکم نکالا ہے وہ کیسے لازمی ہو جائے گا؟

”دین مہر کے لفظ سے جو نکتہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ نکتہ بھی محض ایک نکتہ بار ہے۔ مہر کے لیے ”دین مہر کی اصطلاح تو ہماری اور آپ کی ہے“ قرآن یا حدیث میں تو یہ اصطلاح کمبیں استعمال نہیں ہوئی ہے ان میں یا تو مہر کا لفظ استعمال ہوا ہے یا اس کے ہم معنی کوئی اور لفظ۔ بلکہ پچ پچھیسے تو قرآن یا حدیث میں مہر کے متعلق دین ہونے کا تصور سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے زمانہ میں تو مہر کے متعلق عام قاعدہ یہ تھا کہ جو مہر معین ہوتا تھا عموماً نکاح کے وقت ہی یا اس کے بعد ادا کر دیا جاتا تھا۔ اگر اسی طریقہ کو آج رواج دیا جائے تو اس سے ہزاروں بکھیروں سے چھٹی مل سکتی ہے لیکن ہماری ذہنیت اس معاملہ میں

جو کچھ بن چکی ہے اس کا اندازہ ہی سے کیا جاسکتا ہے کہ ہم نے مہر کو نہ صرف قرض بنا کر رکھ دیا ہے بلکہ ”دین مہر“ کو ایک مستقل اصطلاح شرعی بنا کر لفظ ”دین“ سے اب اجتہادی نکتے پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

کمیشن کی دوسری دلیل۔ جو ایک نقلی دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ہے کہ نکاحوں کی رجسٹری نہ ہونے کے سبب آئے دن دیوانی اور فوجداری عدالتوں میں مقدمے دائر ہوتے رہتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی عورت کے دو مرد شوہر ہونے کے مدعی بن کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات جائداد کے محرم کرنے کے لیے ایک شخص دوسرے وارث کو ناجائز اولاد ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح کفالت کی ذمہ داریوں سے فرار کے لیے مبادعات ایک منکوحہ کو دہشتہ ثابت کرنے کے لیے مقدمات دائر ہوتے ہیں۔ کمیشن کی رائے یہ ہے کہ اگر مہر نکاح کی رجسٹری لازمی قرار دے دی جائے تو مستند تحریری ریکارڈ اسی طرح کے مقدمات کو بہت بڑی حد تک کم کر دے گا۔

جہاں تک اس طرح کے واقعات کے پائے جانے کا تعلق ہے اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن کمیشن نے نکاحوں کی رجسٹری سے یہ جو طریقہ تجویز کیا ہے اس سے یہ مقدمات کم ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھ جائیں گے۔ کمیشن کا تجویز کردہ طریقہ رجسٹری فرضی اور جھوٹی رجسٹریوں کی پوری پوری حوصلہ افزائی کرے گا۔ ہر نکتہ پسند آدمی کے لیے یہ ممکن ہو جائے گا کہ وہ فرضی گواہ اور ایک فرضی نکاح خواں تیار کر کے اور ڈاک خانہ سے اکٹھے آنے کا فارم خرید کر جس کا نکاح جس کے ساتھ چاہے اس پر درج کر دے اور اس کی ایک کاپی بصیغہ رجسٹری حلقہ کے تحصیلدار کے پاس بھیج دے۔ اسی طرح ہر لڑکی اور اس کے ادبیات کو کسی مقدمہ کے چکر میں ڈالا جاسکتا ہے اور تحصیلدار صاحب کا رجسٹران کے خلاف ایک قطع ثبوت نہیں تو کم از کم ایک شرمناک

نزع اور نقصان مایہ دشمنانِ مہار کے لیے ایک بنیاد نو فرام کری دے گا۔ اس سے
خندوں اور شریروں کی خوب بن آئے گی اور تحصیلداروں کے لیے رشوتوں کے دروازے
کھل جائیں گے۔ بااثر بدعاشوں اور بڑے زمینداروں کے علاقوں میں تو اس طریقہ رجسٹری
کے جاری ہونے کے بعد یہ ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل بن جائے گا کہ تحصیلوں میں بیٹے بیٹے جس کی
بہن یا بیٹی کا نکاح وہ جس کے ساتھ چاہیں رجسٹرڈ کرادیں۔ راہ چلتے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں
ڈاکٹروں سے فارم خریدیں گے اور فرضی اندراجات کر کے تحصیلدار کو بھیج دیں گے۔ ان کے اولیاء
کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ اس چیز کو کمیشن کی تجویز کردہ شادی بیاہ کی لیے خرچ عدالتیں اور بھی
شہ دیں گی اور فرضی نکاحوں، جھوٹی رجسٹریوں اور پھر بے بنیاد مقدمات کی وہ بھرمار ہوگی کہ پبلک
پریس آگے گی اور شاید کچھ دنوں کے بعد شادی بیاہ کی مجوزہ عدالتیں بھی چیخ اٹھیں۔

مکن ہے کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ یہ سارے خطرات بالکل فرضی ہیں۔ ان باتوں میں سے
کوئی بات بھی پیش نہیں آئے گی۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات بھی پیش نہیں آئے گی تو ہماری گزارش
یہ ہے کہ پھر رجسٹری کا یہی سیدھا سادہ طریقہ بیناموں، ہسب ناموں، مختار ناموں اور انتقال مال و
جائداد کی دوسری رجسٹریوں کے لیے بھی اختیار کر لیا جائے۔ اتنے آسان طریقہ کے موتے سوتے
مذکورہ صورتوں میں یہ لکھیے کیوں رکھی گئی ہے کہ ہر رجسٹری کے وقت شخصاً تمام فریقین معاملہ
گواموں کو کسی تحصیلدار یا رجسٹرار کی عدالت میں حاضر ہو کر اپنے ایک ایک دستخط اور ایک ایک نشان
انگوٹھا کی تصدیق کر لی پڑتی ہے اور اگر کسی فریق معاملہ کے لیے عدالت میں حاضر ہونا ممکن نہیں ہوتا
ہے تو نہیں داخل کر کے تحصیلدار یا رجسٹرار کو اپنے گھر پر بلانا پڑتا ہے اور وہ غذات کے ہر انداز
کی تصدیق کرتا ہے؟

اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ یہ املاک و جائداد کے معاملات ہیں، اگر ان میں بہل انگاری

بتی جائے اور گھر بیٹھے بٹھائے دستاویزوں کی رجسٹری ہو جایا کرے تو بے شمار جھوٹے انتقال
ہو جائیں گے اور اس کے سبب سے بے شمار مقدمات اٹھ کھڑے ہوں گے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ
لوگوں کے ناموں کا معاملہ کیا املاک و جائداد سے کم اہمیت رکھتا ہے؟ کمیشن تو خود اپنے تسلل
میں نکاح کے معاملہ کو جائداد کے معاملہ سے زیادہ اہمیت دے رہا ہے۔ پھر اس اعتراض کے باوجود
لوگوں کے ناموں کے ساتھ شریروں اور بدعاشوں کو بازی کھیلنے کی یہ کھلی جھٹی کیوں دی جا رہی ہے؟
تحصیلدار صاحب کا رجسٹر جس کو ایک مستند ریکارڈ کی حیثیت دی جا رہی ہے، غور کیجیے کہ کمیشن
کی تجویز کردہ صورت میں وہ بے شمار جھوٹی سچی رپورٹوں کی ایک کھنونی ہوگا یا کوئی مستند ریکارڈ؟
اس ریکارڈ کی ہر چیز کو بڑی آسانی سے عدالت میں چیلنج کیا جاسکتا ہے اور بجائے اس کے کہ اس سے
نصفیہ معاملات میں کوئی آسانی پیدا ہو سزاوارہ مشکلیں اور ہزار ہا نزاعات خود اس ریکارڈ کے سبب سے
ظہور میں آئیں گی۔

کمیشن کی تیسری دلیل۔ جس کی حیثیت نفاذ رک ہے۔ یہ ہے کہ پارسی میرج ایکٹ
میں یہ چیز موجود ہے۔ البتہ یہاں بھی ہر نکاح کی رجسٹری ضروری قرار دی گئی ہے اور ہارون الرشید
کو بھی نکاح کی رجسٹری پر اصرار تھا۔

جہاں تک پہلے مثال کا تعلق ہے اس کی بابت تو میں صرف یہی عرض کروں گا کہ بڑے ہی
سپت ذہن کے میں وہ لوگ جو امت محمدی علیہ وسلم کے لیے پارسی قوم کی کوئی بات بطور
اسوہ حسنہ کے پیش کرتے ہیں، ہر شخص جانتا ہے کہ ایشیا کی قوموں میں مغربی تہذیب کا جتنا گہرا
رنگ پارسی قوم نے اختیار کیا ہے اتنا گہرا رنگ کسی بھی دوسری قوم نے اختیار نہیں کیا۔ ان کی
تہذیب و معاشرت اور ہماری تہذیب و معاشرت میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ ان کا حال تو یہ ہے
کہ شادی کے موقع پر اگر دو لہا دہن اور ان کے تمام مرد اور عورت غریبوں کو پوری بارانِ رحمت

کسی عدالت میں نکاح کی رجسٹری کے لیے حاضر ہونا پڑے تو وہ شاید اس میں بھی کوئی زحمت اور تکلیف محسوس نہ کریں۔ لیکن کیا آپ کا معاشرہ بھی اس چیز کا تحمل ہو سکتا ہے۔

الجیریا اور مراکو وغیرہ ملک کی نظیر بھی ایک بالکل غلط نظیر ہے۔ ان علاقوں کے مسلمان اپنے مغربی مستعمروں کے پنجے استبداد میں گرفتار ہیں۔ ان علاقوں میں سے بعض کا حال تو یہ ہے کہ وہاں مسجدیں بھی غیر مسلموں کی تولیت میں ہیں۔ کیا ان کی مثال کی پیروی ہی آپ بھی اپنی مسجدوں کی تولیت غیر مسلموں کے حوالہ کرنے کے لیے تیار ہیں؟

ہارون الرشید کو اگر اس چیز پر محض اصرار ہی تھا، عملاً اس نے اس کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا، تو یہ اس کی دانش مندی کی ایک میل ہے، معلوم ہوتا ہے اس کی رائے کی غلطی اس پر خود واضح ہو گئی ورنہ جو زور و اقتدار اس کو حاصل تھا اس کے ہوتے ہوئے اگر وہ یہ کام کرنا چاہتا تو اس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا تھا۔ اب یہ آپ کی عقلمندی نہیں ہوگی کہ جو کام ارادہ کر کے وہ کرنے سے رک گیا آپ اس کو کر گزریں۔

اپنی سفارش کے حق میں کمیشن کے یہ نقلی اور عقلی دلائل ہیں۔ جو میں نے واضح طور پر آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں ادا ان میں جو کمزوریاں ہیں وہ بھی بیان کر دی ہیں۔ اب آپ خود موازنہ کر کے دیکھ سکتے ہیں کہ ان دلائل میں کس قدر وزن ہے۔

اس تجویز کے اندر معاشرہ کے لیے جو نقصانات پوشیدہ ہیں اب میں بالاجمال ان کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ سب سے پہلا نقصان تو یہ ہے کہ سرنکاح کی رجسٹری لازمی قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ جس نکاح کی رجسٹری نہیں ہوئی ہے وہ قانوناً ناجائز قرار پائے اور اس سے جو بچے پیدا ہوں وہ حرا کی اور پدری جائداد سے محروم ٹھہریں۔ ظاہر ہے کہ یہ قانون صریحاً شریعت کے

قانون کے خلاف ہوگا، کیونکہ شریعت میں تو ہر وہ نکاح منعقد ہو جاتا ہے جو دو گواہوں کی موجودگی میں ہو۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ قانون اور شریعت میں کھلا ہوا تصادم پیدا ہو جائے گا۔ شریعت جس چیز کو جائز قرار دے گی، عدالت اس کو ناجائز ٹھہرائے گی اور اسلام جن کو جائز وارث قرار دے گا آپ کی عدالتیں ان کو محروم قرار دیں گی۔ اس طرح ارکان کمیشن اس ملک میں، جو اپنے دستور کی رو سے اسلام کے قوانین کی نفاذ کی ذمہ داری اٹھا چکا ہے، شرع اور ملکی قانون میں ایک خوفناک جنگ برپا کرنا چاہتے ہیں اور اسلام نے جن چیزوں کو جائز ٹھہرایا ہے ان کو اس ملک کی تعزیرات میں جرائم کی فہرست میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔

۲۔ اس طریقہ رجسٹری کے قانونی شکل اختیار کر لینے کے بعد شریعوں کے لیے شریفیہوں اور بیٹیوں کے ناموس کو خطرہ میں ڈال دینے کی نہایت وسیع راہیں کھل جائیں گی۔ وہ بڑی آسانی کے ساتھ جس کا نکاح جس کے ساتھ چاہیں گے تحصیلدار کے رجسٹر میں درج کرادیں گے۔ دراصل ایک ایسے کے یا اس کے اولیاء کے فرشتوں کو بھی اس چیز کی خبر نہ ہوگی اور پھر اس چیز کو اس کے خلاف ایک مقدمہ کی بنیاد بنالیں گے۔

۳۔ اس سے جھوٹے مقدمات کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا اور با اثر غنڈوں کے لیے اغوا اور جبری نکاحوں کے کاروبار میں بڑی سہولتیں پیدا ہو جائیں گی۔ وہ آج ایک لڑکی کا فرضی نکاح رجسٹری کرائیں گے اور دوسرے روز اس کو اس کے باپ اور بھائی کے گھر سے غائب کر دیں گے۔

۴۔ ان خطرات سے بچنے کے لیے غالباً اگلا قدم جو اٹھایا جائے گا وہ یہ ہوگا کہ نکاح کی رجسٹری کے لیے بھی وہی طریقہ اختیار کر لیے جائیں جو بیعتوں اور سہ ناموں وغیرہ کی

رجسٹری کے لیے اس وقت رائج ہیں۔ اس صورت میں سرنکاح کی رجسٹری کے لیے یا تو دو لکھا
دہن کو گواہوں اور اولیاء سمیت کسی عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ یا پھر کافی خرچ کر کے
عدالت کو اپنے دروازہ پر بلانا پڑے گا۔ یہ رجسٹری کو لازم قرار دینے کا قدرتی نتیجہ ہے جو
کچھ سرحد کے بعد لازماً ظاہر ہو کر رہے گا۔ کمیشن نے پہلے اس رسم و راہ سے ہمیں آگاہ کرنا چاہا
ہے۔ اگر ہم نے اس کو قبول کر لیا تو اس کو توقع ہے کہ آگے چل کر آپ عدالتوں میں حاضر ہو کر
نکاح بندھوانا بھی منظور کر لیں گے۔

۵۔ ہماری دیہی آبادی، جس میں مروجہ سادہ طریقہ کا نکاح پڑھانے والے بھی مشکل ہی سے
ملتے ہیں، اس طریق نکاح کے نافذ ہوجانے کے بعد ایک ناقابل برداشت مصیبت میں مبتلا
ہو جائے گی۔ کوئی شخص آسانی کے ساتھ نکاح پڑھانے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ اول تو اداکاران
کمیشن کا ”معیاری نکاح نامہ اور معاہدہ نکاح غالباً اتنا پیچیدہ ہوگا کہ اس کی خانہ پوری کے لیے
کسی وکیل کی خدمات مطلوب ہوں گی۔ ثانیاً نکاح خواں کو ہر وقت یہ اندیشہ ہوگا کہ معلوم
نہیں کس نکاح میں وہ پانچ سو روپے حیرانہ کی زد میں آجائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو شخص اپنے
لڑکے یا لڑکی کا نکاح کرنا چاہے گا اسے شہروں سے پیشہ ور نکاح خواہوں کی خدمات
حاصل کرنا ہوں گی اور اس کے لیے وہ سارے پاڑے پیلے پڑیں گے جو آج ایک وکیل حاصل کرنے
کے لیے پیلے پڑتے ہیں۔

شادی کی عمر کمیشن کی سفارش ہے کہ کسی کی بنیادیوں کو روکنے کے لیے اٹھارہ سال سے
کم عمر کے لڑکے اور سولہ سال سے کم عمر کی لڑکی کی شادی قانوناً ناجائز قرار دے دی جائے۔

کمیشن نے اپنی اس سفارش کی تائید میں پہلی دلیل یہ دی ہے کہ قرآن میں یتیموں کو ان کا
مال سپرد کرنے کے متعلق یہ ہدایت آئی ہے کہ حَتَّىٰ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاتِّسَّمُوْا

مِنْهُمْ رُشْدًا اَوْ اَرْحَمُوْا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں
تو اگر تم ان میں سے جو بوجھ پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو) کمیشن نے اس آیت سے یہ استدلال
کیا ہے کہ جب مال سپرد کرنے کے لیے صرف بلوغ کی نہیں بلکہ مزید صلاحیت پیدا ہونے کی
قرآن نے قید لگائی ہے تو نکاح کا معاملہ تو مال کے مقابل میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے
اگر ہم شادی کے لیے بلوغ سے کچھ زیادہ عمر کی قید لگا دیں تو یہ ایک بالکل معقول بات ہوگی۔

لیکن تجھے ان لوگوں کی قرآن فہمی پر حیرت ہوتی ہے کہ جب قرآن نے خود بلوغ کو لفظ
”نکاح“ یعنی شادی کی عمر سے تعبیر کیا ہے تو اب اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کس دلیل کی
ضرورت باقی رہ گئی کہ شادی کی عمر بلوغ ہے۔ یہ تو بلوغ کے عمر نکاح ہونے پر ایک ایسی نص صریح
ہے کہ اس کے بعد کسی بحث و اختلاف کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی۔

رشد کے معنی یہاں معاملات کی سوجھ بوجھ اور انتظامی صلاحیت کے ہیں۔ اسلوب کلام
دلیل ہے کہ یہاں اس کا ذکر بلوغ کے بعد ایک مزید شرط کے طور پر آیا ہے۔ اس کی ضرورت اس
وجہ سے پیش آئی کہ معاملہ کاروبار کی دیکھ بھال کا تھا۔ کسی یتیم کو اس کا کاروبار حوالہ کرتے وقت
صرف یہی دیکھنا کافی نہیں ہے کہ وہ بالغ ہو گیا ہے بلکہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے
کاروبار کو سنبھال بھی سکے گا یا نہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ بالغ ہو چکے کے باوجود ابھی ایسا احمق
اور بے پردا ہو کہ کاروبار کے انتظام و انصرام کی طرف اس کا ذہن متوجہ ہی نہ ہوتا ہو۔ لیکن اس کے
معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کی شادی بھی نہیں ہوتی چاہیے۔ شادی نہ کرنے کی صورت میں اس کا بڑا
اندیشہ ہے کہ وہ کسی غلط راستہ پر پڑ جائے اور پھر اس کی اصلاح ناممکن ہو جائے برخلاف اس کے
اگر اس کی شادی کر دی جائے تو بہت ممکن ہے کہ یہ چیز اس کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا
کر دے اور وہ نہ صرف اپنی بیوی کے لیے ایک اچھا شوہر ثابت ہو بلکہ اپنی جائداد اور اپنے

کاروبار کا عمدہ منتظم بھی بن جائے اس وجہ سے کمیشن نے یہ کوئی اچھا اجتہاد نہیں فرمایا کہ شخص کی شادی انتظامی صلاحیت کے ساتھ باندھ دی جائے۔

پھر کمیشن نے یہ کیسے اندازہ کیا کہ ہر لڑکے کے اندر ۸ سال کی عمر میں ہی رشد پیدا ہوا کرتا ہے۔ کتنے ہی جو اس سے کم عمر میں صاحبِ رشد ہو جاتے ہیں اور کتنے ہی ہیں جو بیس بائیس بلکہ پچیس سال تک بھی اٹھڑے اٹھڑے رہتے ہیں۔ اگر رشد بھی شادی کے لیے ایک ضروری شرط ہے تو اٹھارہ سال کی عمر اس کے لیے ہرگز کوئی موزوں عمر نہیں ہے۔ پھر تو قیس سال کی عمر سے زیادہ موزوں رہے گی۔

کمیشن کی دوسری دلیل یہ ہے کہ شادی کی عمر مقرر کر دینا قرآن یا حدیث میں کہیں ممنوع نہیں ہے اس لیے ہم کو یہ حق حاصل ہے کہ ہم اس کی تعیین کر دیں۔

کمیشن نے یہاں اپنے اس اصولِ اجتہاد کو استعمال کیا ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں یہ اصول خود کمیشن کے الفاظ میں یوں ہے کہ ”جو چیز قطعی اور غیر مشروط طور پر کسی واضح حکم کے ذریعہ سے ممنوع نہیں ہے وہ جائز ہے“ چونکہ قرآن اور حدیث میں کہیں واضح اور قطعی طور پر اس بات کی ممانعت نہیں ہے کہ شادی کی عمر کی تعیین نہ کی جائے۔ اس لیے کمیشن نے تعیین کر دی ہے کمیشن کے اس اصول کی غلطیاں وضاحت کے ساتھ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں یہاں ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک سوال یہ یہاں ارکانِ کمیشن سے پوچھنا ہوں کہ کیا سولہ یا اٹھارہ سال کی عمر سے کم عمر میں شادی کرنے کی قرآن یا حدیث میں کہیں ممانعت ہے ؟ اگر نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو آپ کے اپنے بیان کردہ اصول کے مطابق یہ جائز ہے۔ اس جائز کو آپ حرام کیسے کر سکتے ہیں ؟ غیر مفید کو مفید کرنے، غیر مشروط کو مشروط بنانے اور مباح کو ممنوع کرنے کا حق آپ کو کس نے دیا ہے۔

غالباً کمیشن نے اپنے اس اصولِ اجتہاد کی لغویت بھی خود ہی محسوس کی ہے اس وجہ سے اس کو سہارا دینے کے لیے خود اپنے ہی ایجاد کردہ ایک دوسرے اصول سے کام لیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اسلام کو کسی کی شادیوں کی ممانعت تو نہایت واضح اور قطعی الفاظ میں کرنی تھی، لیکن چونکہ سوسائٹی اس وقت اپنے دورِ طفولیت میں تھی اور سوسائٹی کے اس دور میں کسی کی شادیاں زیادہ خطرناک نہیں ہوتیں۔ اس وجہ سے اسلام نے اس وقت اس کی ممانعت نہیں کی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ کسی کی شادیوں کی ممانعت کسی خاص واضح حکم کے ذریعہ سے اس سبب سے نہیں کی گئی کہ معاشرتی ارتقاء کے ایک خاص دور میں یہ چیز کچھ زیادہ خطرناک نہیں ہوتی۔

میں تھوڑی دیر کے لیے کمیشن کا یہ نقطہ نظر تسلیم کیے لیتا ہوں کہ اسلام کے ظہور کے وقت انسانی معاشرہ اپنے دورِ طفولیت میں تھا۔ لیکن یہ بات میں کبھی چاہتا ہوں کہ اس کا کیا سبب تھا کہ اس وقت کے معاشرہ میں سولہ اور اٹھارہ سال سے کم عمر کی شادیاں مضر نہیں ہوتی تھیں لیکن اب وہ مضر ہو گئی ہیں۔ کیا اس کا سبب یہ ہے کہ سوسائٹی کے اس دورِ طفولیت میں لڑکے اور لڑکیاں سولہ اور اٹھارہ سال سے پہلے بالغ ہی نہیں ہوتے تھے ؟ یا اس کا سبب یہ ہے کہ اس وقت کے لڑکوں اور لڑکیوں میں عفت اور پاکدامنی کا احساس مفقود تھا اور اب یہ احساس آٹھواں اور ہو گیا ہے کہ مجال نہیں کہ سولہ یا اٹھارہ سال سے پہلے کسی لڑکے یا لڑکی کو جنسی جذبہ کسی بے راہ دہی میں مبتلا کرے ؟ یا اس کا سبب یہ ہے کہ معاشرہ کے ابتدائی دور میں جیسا عفت اور پاکدامنی کے کچھ احمقانہ تصورات پائے جاتے تھے جس کے سبب سے اس دور کے لوگ بہت جلدی لڑکوں اور لڑکیوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ دیتے تھے اور اب چونکہ تعلیم و تہذیب کی ترقی سے ان ادہام کا پوری طرح انالہ ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے کم از کم سولہ اور اٹھارہ سال سے پہلے ان کی آزادی پر کسی تدبیر کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے ؟

کمیشن نے چونکہ ان سوالات کو صاف نہیں کیا ہے اس وجہ سے میرے لیے یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ وہ کس سبب سے کمسن کی شادیوں کو اسلام کے ابتدائی معاشرہ میں تو جائز مانتا ہے لیکن اب اس معاشرہ میں اس کو حرام ٹھہرانا چاہتا ہے۔ اگر کمیشن اپنے عہد کے معاشرہ کے متعلق کسی حسن ظن میں مبتلا ہے تو اس کے اطمینان کے لیے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ امریکہ کے اٹارنی جنرل ٹام کلارک نے فیڈرل جوڈیسیٹ آف انوسٹی گیشن اسٹیکس کے حوالہ سے یہ بات نقل کی ہے کہ قتل، فریب اور زنا کے جرائم میں سب سے زیادہ اوسط سترہ سال کے نوجوانوں کا ہے خصوصاً زنا کے جرائم میں ان کا تیس فیصد حصہ ہے۔ یہ صرف ان نوجوانوں کا اوسط ہے جو زنا کے جرم میں گرفتار ہوئے ہیں اور اٹھارہ سال سے کم عمر کی لڑکیوں کا اوسط انہی کا ناموں میں دوسری جنگ عظیم کے بعد اس نے اس کا لگنا بیان کیا ہے اور اگر صرف جنس جذبہ کے بھانات کا اندازہ کرنا ہو تو میں کمیشن کو (HINSAY REPORTS) کے پڑھنے کا مشورہ دوں گا۔ اس سے کمیشن کو معلوم ہوگا کہ موجودہ مغربی سوسائٹی میں یہ جذبہ پانچ سال کی عمر سے اپنا فعل شروع کر دیتا ہے اور سولہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے تودہ طوفان پھا جاتا ہے اور اس کے وہ کارنامے مغربی سوسائٹی میں نمایاں ہو رہے ہیں کہ ہم اور آپ یہاں بیٹھے ہوئے ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کمیشن کس اعتبار سے کمسن کی شادیوں کو موجودہ معاشرے کے نمایاں نشان نہیں خیال کرتا۔

ملکن ہے کسی کو یہ گمان ہو کہ موجودہ معاشرہ میں آدمی کو تعلیمی مراحل سے گزرنے میں کافی نمانہ لگتا ہے اور جب تک آدمی ان تمام مراحل سے گزر نہ لے اس کو قید نکاح میں جھکڑ دینا معاشرہ کی ترقی کو روک دینے کے ہم معنی ہے۔ میرے نزدیک یہ خیال بھی کسی طرح صحیح نہیں ہے ہر شخص جانتا ہے کہ ہمارے معاشرہ میں کمسن کی شادیوں کا رواج بہت کم ہے۔ بلکہ تعلیم یافتہ

اور شہری طبقات میں تو ایک عرصہ سے یہ شکایت بڑھ چلی ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیوں میں اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ بہت سی لڑکیاں شادی کے خیال ہی سے مستعفی ہو جاتی ہیں۔ ایسے معاشرہ میں اس طرح کا قانون بنانا ظاہر ہے کہ بالکل تحصیل حاصل ہے۔ اس سے اگر رکاوٹ عائد ہوگی تو ان طبقات پر عائد ہوگی جو دیہاتوں میں غریبانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور لڑکے یا لڑکی کے بلوغ کے بعد اس کی شادی کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ آخر آپ ان کے ایک معقول کام میں کس مقصد کے لیے رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ہماری دیہاتی آبادی میں بھی کم سن کی شادیوں کا رواج ان معنوں میں نہیں ہے جن معنوں میں اس کا رواج پہلے ہندوؤں میں تھا، بلکہ وہ بھی بلوغ کے بعد کی شادیوں کا ہے، اور اگر ہمارے ملک کے کسی حصہ میں کسی درجہ میں بھی اس کا رواج ہے تو اس کو تعلیم کی ترقی کے ذریعہ سے نہایت آسانی سے روکا جاسکتا ہے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ہر کام کے لیے قانون کا لٹھی گھمایا جائے۔

اب وہ نقصانات ملاحظہ فرمائیے جو نکاح کے لیے ایک خاص عمر از روئے قانون مقرر کر دینے کے بعد افراد اور سوسائٹی کو پہنچیں گے۔

۱۔ اس کا سب سے بڑا نقصان تو یہ ہے کہ جو چیز اسلام میں جائز ہے وہ ہمارے ملکی قانون میں حرام ہو جائے گی۔ ہماری عدالتیں ایسے نکاحوں کو جو قانون کی مقرر کردہ عمر سے پہلے ہو جائیں، جائز تسلیم نہ کریں گی۔ ایسے نکاحوں سے جو اولادیں پیدا ہوں گی ان کو وہ حرامی ٹھہرائیں گی اور پوری میراث میں ان کو حصہ نہ دیں گی۔ یہ ساری باتیں صرف اسلام کے خلاف ہیں اور اسلام کے ساتھ ہمارے ملکی قانون کا یہ تضادم ہمارے ملک اور ہماری قوم کے لیے مہلک ہوگا۔

۲۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ اگر نکاح کے لیے ایک خاص عمر مقرر کی گئی تو یہ بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ پیدائش کی رجسٹری (BIRTH REGISTRATION) بھی از روئے قانون

لازمی قرار دی جائے۔ یہ چیز لوگوں پر عموماً اور ہماری دیہاتی آبادی پر خصوصاً ایک ایسا بوجھ بنے گی جس کو ہر شخص محسوس کرے گا اور ان لوگوں پر لعنت بھیجے گا جو یہ اصرار اور یہ قیدی اور پابندیاں بڑھانے کا باعث بنیں گے۔

۳۔ اس سے ہمارے معاشرہ میں عموماً اور دیہاتی آبادی میں خصوصاً زنا اور اغوا کی وارداتیں بہت بڑھ جائیں گی۔ غرباء اور مزاحمتی طبقہ اپنے مالکوں، ان کے کارندوں اور بااثر مشریوں کی طرف سے اپنے ناموس کے معاملہ میں ہمیشہ خطرہ میں رہا ہے۔ یہ ایک بڑا سبب تھا اس بات کا کہ وہ لڑکیوں کے نکاح سے جلدی سے جلدی فارغ ہونے کی کوشش کرتا تھا، اس قانون کے بن جانے کے بعد وہ اپنے ناموس کی حفاظت کے معاملہ میں اپنے آپ کو بالکل بے بس پائے گا۔ موجودہ حالات میں تو وہ اپنے ناموس کی حفاظت کی واحد تدبیر ہی چیز کو سمجھتے تھے کہ بالغ ہوتے ہی لڑکی کا نکاح کر دیں۔ اب سولہ برس کی عمر تک لڑکیوں کا نکاح تو نہ ہو سکے گا، البتہ وہ زور آور لوگوں کے ناجائز تصرفات کی تختہ مشق بنتی رہی گی۔

۴۔ ہمارے اندر لاکھوں آدمیوں کو جو شکلیں پیش آئیں گی ان کا ایک ملک سا تصور اپنے ذہن کے اندر پیدا کرنے کے لیے چند مثالوں پر غور فرمائیے۔ فرض کیجئے، ایک غریب آدمی ہے اس کے پاس وسائل کی کمی ہے اس کے متعدد بالغ لڑکے اور لڑکیاں موجود ہیں جن کے نکاح کی ذمہ داریوں سے وہ عہدہ براہ منہ نبھاتا ہے۔ آج اسے کوئی مزدور رشتہ مل رہا ہے لیکن وہ اپنے کسی لڑکے یا لڑکی کا نکاح محض اس وجہ سے نہیں کر سکتا کہ ان کی عمریں اٹھارہ یا سولہ سال سے کم ہیں۔ بعد میں نہ تو ملا ہوا وہ موندوں رشتہ ہی باقی رہے گا نہ اس کے موجودہ وسائل ہی اس کا ساتھ دے سکیں گے۔ ایک شخص کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہے اسے اپنی زلیبت کی توقع نہیں ہے، اس کی بالغ لڑکی ہے اسے اندیشہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ لڑکی کے ساتھ اچھا سلوک

نہ کریں گے۔ وہ چاہتا ہے کہ لڑکی کے نکاح سے فارغ ہو جائے تاکہ دنیا سے اطمینان اور سکون کے رخصت ہو سکے۔ وہ محض اس وجہ سے اپنی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا کہ لڑکی از روئے قانون ابھی سولہ سال کی عمر کو نہیں پہنچی ہے۔ ایک بیوہ ہے اس کی ایک بالغ لڑکی ہے اس کا کوئی اور دلی وارث نہیں ہے جس کے اعتماد پر وہ لڑکی کو گھر میں روک سکے۔ اسے اندیشہ ہے کہ اگر وہ جلد ہی کسی بھلے مانس کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ پکڑا نہ دے تو ممکن ہے لڑکی غنڈوں کے ہتھے چڑھ جائے۔ لیکن وہ محض اس وجہ سے یہ قدم نہیں اٹھا سکتی کہ ایک قانون سولہ سال کی عمر سے پہلے اس کو لڑکی کا نکاح کرنے سے روکتا ہے۔ ایک خدا ترس اور بااخلاق مسلمان ہے، وہ دیکھ رہا ہے کہ اس کا لڑکا بڑی صحبت میں پڑ کر خراب ہو رہا ہے۔ اسے توقع ہے کہ اگر وہ اس کا کہیں نکاح کر دے تو شاید وہ سنبھل جائے لیکن وہ یہ حیرت انگیز اس وجہ سے نہیں کر سکتا کہ لڑکے کی عمر اٹھارہ سال سے کم ہے۔ اس طرح کی بیسیوں شکلیں آپ فرض کر سکتے ہیں اور یہ محض مفروضات نہیں ہیں بلکہ یہ مفروضات کل واقعات نہیں گئے اور ہزاروں لاکھوں انسانوں کو ان تلخ تجربات کے سابقہ پیش آئے گا اور ان کے نتیجے میں جو نقصان ابھریں گے وہ پوری قوم میں پھیلیں گے۔

۵۔ اس سے ہماری قوم کے اخلاقی زوال کی رفتار (جو اب بھی خاصی تیز ہے) تیز سے تیز تر ہو جائے گی۔ اسکولوں، کالجوں اور ہوسٹلوں کی فضا خراب سے خراب تر ہو جائے گی۔ سبناؤں اور عجب خانوں کی رونق آج کی نسبت کہیں زیادہ ہوگی جنسی تسکین کے خلاف فطرت اور صحت طریقے نوجوانوں میں عام ہو جائیں گے۔ بے پردگی اور بے حیائی، عریانی اور فحاشی کے رجحانات میں دن و رات پوچھنی ترقی ہوگی۔ زنا اور اغوا کی وارداتوں میں کمی گنا اضافہ ہو جائے گا۔ کمیشن کی سفارشات مقررہ عمر سے پہلے نکاح پر تو قدغن لگاتی ہیں مگر زنا پر کسی قدغن کا خیال ان میں نہیں پایا جلتا۔

۶۔ اس کے سبب سے وہ سارے لوگ مبتلائے گناہ ہوں گے جن کی بالغ اولاد میں اس قانون کے باعث کسی فتنہ میں پڑی گی۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :-

صن ولد له ولد بلیعن اسمہ جس کو خدا اولاد دے اسے چاہیے کہ
و ادبہ فاذا بلغ فلیزوجه فان وہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کی اچھی تربیت
بلغ ولم یزوجه فاصاب اثما کرے اور جب بالغ ہو جائے تو اس کی شادی
فانما اثمہ علی اسبہ کرے اگر وہ بالغ ہو جائے اور اس کی شادی

کی جائے اور اس کے سبب سے وہ کسی گناہ میں مبتلا
ہو تو اس گناہ کا بوجھ اس کے باپ پر ہوگا۔

(مشکوٰۃ)

اس سفارش کے قانون کی شکل اختیار کرنے سے پہلے ہر وہ شخص جو کسی لڑکے یا لڑکی کا باپ ہے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ اگر وہ اس قانون کے بننے پر راضی ہے تو اس کے نتیجے میں اس کی اولاد جن فتنوں میں مبتلا ہوگی اس کے گناہوں سے جس طرح ان سفارشات کے مرتب کرنے والوں اور ان کو قانونی شکل دینے والوں کے اعمال نامے سیاہ ہوں گے اسی طرح ان باپوں کے اعمال نامے بھی سیاہ ہوں گے جو ان سفارشات پر راضی یا خاموش رہیں گے۔

۷۔ اس طرح کا قانون نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام حبیب الفکر صحابہ کے خلاف ہماری طرف سے بے اعتمادی بلکہ ملامت کا ایک اعلان ہے کیونکہ خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نکاح کیا اور اس وقت ان کی عمر سولہ سال سے کم تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی حضرت ام کلثوم سے نکاح کیا اور ان کی عمر بھی ہرگز سولہ سال کو نہیں پہنچی تھی۔ جب ہماری آمدہ نیس ایک طرف یہ قانون پڑھیں گی اور دوسری طرف اسلام

یہ تاریخ پڑھیں گی تو کیا ان کے ذہنوں میں یہ خیال نہیں پیدا ہوگا کہ ہمارے بہترین اسلام یہاں تک کہ ہمارے پیغمبر بھی العباد باعشا آج اس ملک میں ہوتے تو ہمارے قانون کے رُود سے مجرم ہوتے۔

عورت کے لیے سادی حق طلاق [کمیشن کی سفارش یہ ہے کہ یہ بات از روئے قانون جائز کر دی جائے کہ اگر عورت کو مرد کی طرف سے معاہدہ نکاح میں حق طلاق تفویض کر دیا گیا ہو تو وہ بھی مرد کی طرح طلاق دے سکتی ہے۔

اس بات کو جائز ثابت کرنے کے لیے پہلے کمیشن نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ معاہدہ نکاح میں ایسی شرطیں شامل کی جاسکتی ہیں یا نہیں جو اسلام اور اخلاق کے منافی نہ ہوں اور ان شرطوں کو عدالتوں کے ذریعے نافذ کیا جاسکتا ہے یا نہیں ؟ پھر اسی کے ساتھ ایک دوسرا سوال یہ جوڑ دیا گیا ہے کہ یہ بات جائز ہے یا نہیں کہ از روئے قانون یہ صحیح تسلیم کیا جائے کہ معاہدہ نکاح میں یہ شرط درج ہو سکتی ہے کہ عورت کو بھی اعلان طلاق کا وہی حق حاصل ہوگا جو مرد کو حاصل ہے ؟

کمیشن کے نزدیک ان دونوں سوالوں کا جواب قطعی اثبات میں ہے۔ اس وجہ سے اس کا فتویٰ یہ ہے کہ اس کے تجویز کردہ معیاری نکاح نامہ میں یہ شرط شامل کر دی جائے کہ عورت کو بھی طلاق دینے کا وہی حق حاصل ہوگا جس طرح شوہر کو حاصل ہوگا۔ معاہدہ نکاح میں اس شرط کے درج ہوجانے کے بعد عدالت کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ شوہر کو اس شرط کے ایفاء پر مجبور کرے۔

اس کے جواز کی تائید میں کمیشن نے شرح وقایہ سے فقہ کا ایک جزئیہ بھی ڈھونڈ نکالا ہے۔ وہ یہ کہ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی سے یہ کہہ بیٹھے کہ "تو جب چاہو اپنی اوپر

طلاق دارد کہ بیچو تو عورت کو یہ حق حاصل ہو جانا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں جب چاہے اپنے اوپر طلاق وارد کر سکتی ہے۔

نکاح کی شرائط کے متعلق چند باتیں اصولی طور پر پیش نظر رکھنی چاہئیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ جو چیزیں رشتہ ازدواج کے فطری اور اخلاقی تقاضوں میں از خود شامل ہیں۔ ان کے سوا دوسری کئی نئی شرطیں ایجاد کرنا اور ان کو شرائط نکاح کی حیثیت سے میاں بیوی کا ایک دوسرے پر عائد کرنا اور ان کو ایک معاہدہ نکاح میں درج کر کے عدالتوں کے ذریعہ سے نافذ کرانے کی کوشش کرنا منشاء اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ مرد بیوی کے حقوق زوجیت ادا کرے۔ اس کے نان نفقہ کا بار اٹھائے، جو پہنے وہ پہنائے، جو کھائے وہ کھلائے، اس کے آرام و راحت کا خیال رکھے۔ اگر اس کے کوئی اور بیوی بھی ہو تو دونوں کے درمیان عدل کرے، یہ سب نکاح کے فطری تقاضے ہیں۔ اور ان کا پورا کرنا اس معاہدہ کے رُوسے ضروری ہے جو بندہ خدا سے کر چکا ہے، خواہ یہ باتیں کئی معیاری نکاح نامہ میں درج ہوں یا نہ ہوں۔ اسی طرح بیوی کے لیے ضروری ہے کہ وہ شوہر کے جذبات اور اس کی خواہشوں کو ملحوظ رکھے۔ اس کے گھر اور اس کے بچوں کی دیکھ بھال اپنے ذرائع میں سمجھے۔ اس کے بستر کو کسی غیر سے پامال نہ کرے۔ اس کے رنج و راحت کی مشربک بنے، اس کے رازوں کی حفاظت کرے۔ ان ساری باتوں کی پابندی اس معاہدہ کی رُوسے عورت پر واجب ہے جو اپنے آپ کو کسی مرد کے حوالہ عقد میں دے کر اس نے اپنے رب سے کیا ہے، خواہ یہ باتیں کسی معاہدہ نکاح میں درج ہوں یا نہ ہوں۔ ان فطری شرائط کے سوا دوسری کئی نئی شرطیں ایجاد کرنا اور میاں بیوی کا ایک دوسرے کو ان شرطوں سے باندھنے کی کوشش

کرنا، جیسا کہ عرض کیا گیا، اسلام کے منشا کے بالکل خلاف ہے۔ اس سے بھی اعتماد و محبت کے بجائے شروع ہی سے میاں اور بیوی کے درمیان بدگمانی اور بے اعتمادی کی ایک بنیاد پڑ جاتی ہے اور جب بنیاد ہی غلط پڑ جائے تو آگے چل کر عمارت کا ٹھیک بننا کس طرح ممکن ہے؛ بخاری شریف میں یہ جو حدیث ہے کہ حق الشریعہ ان توفیہ ما استحللتمہ فی الفروج (سب سے زیادہ پوری کیے جانے کے لائق وہ شرطیں ہیں جن کے ذریعہ سے تم نے ایک عورت کو اپنے لیے جائز کیا ہے) اس سے مراد خود ایجاد کردہ نئی شرطیں نہیں ہیں بلکہ وہی شرطیں ہیں جو رشتہ ازدواج کے مقتضیات میں شامل ہیں اور جن کا ذکر خود قرآن و حدیث میں پوری وضاحت کے ساتھ آگیا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مذہب یہ ہے کہ جو شرطیں کتاب و سنت میں نہیں ہیں وہ سب باطل ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر ایسی شرط جو رشتہ ازدواج کے مطالبات کے منافی ہو یا سرے سے اس حکیم کی کوئی نیت کرنے والی ہو جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے عائلی نظام کے لیے پسند فرمائی ہے، وہ باطل ہے، اس بات میں تو ہمارے فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا ہے کہ صرف یہ شرطیں ہی باطل ہوں گی، نکاح باقی رہے گا، یا ساتھ ہی نکاح بھی باطل ہو جائے گا لیکن اس پر سب متفق ہیں کہ اس طرح کی تمام شرطیں باطل ہیں۔ اگر کوئی خاص ضرورت داعی ہے تو مرد معاہدہ نکاح میں یہ شرط تو کر سکتا ہے کہ وہ ہر فرد ادا کرے گا یا ایک خاص مدت کے اندر اندر ادا کرے گا یا رہن کے طور پر وہ کوئی چیز بیوی کے قبضہ میں دے گا یا کوئی دوسری ضمانت دے گا، یا اس کے نان نفقہ یا اس کی رہائش سے متعلق وہ کوئی انتظام اس کی خواہش کے مطابق کرے گا لیکن کوئی شرط میاں یا بیوی کی

طرف سے معاہدہ نکاح میں اس قسم کی شامل نہیں کی جاسکتی کہ مرد بیوی سے ملاقات نہیں کرے گا۔ یا اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دے گا، یا پہلی بیوی کو نان نفقہ نہیں دے گا، یا اس کے لیے باری مقرر نہیں کرے گا۔ اس طرح کی تمام شرطیں مقاصد نکاح کے بالکل منافی ہیں، علیٰ ہذا القیاس مرد معاہدہ نکاح میں اپنے ان حقوق اور ان ذمہ داریوں سے بھی استعفا نہیں دے سکتا جو اس پر بحیثیت قوام کے عائد ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنے گھر کے معاملات میں کوئی دخل نہیں دے گا، بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی شادی بیاہ کے معاملات سے بے تعلق رہے گا۔ نشو و نما پر بیوی کو کبھی تاویب نہیں کرے گا، بیوی کی آمد و رفت پر کوئی اعتراض نہ کرے گا، اخلاقی اور مذہبی کمزوریوں پر گرفت نہیں کرے گا، کبھی اس کو بستر میں تنہا نہیں چھوڑے گا، یا کسی حالت میں اس کو طلاق نہیں دے گا۔

یہ سارے حقوق و فرائض اللہ تعالیٰ نے درحقیقت مرد اور عورت دونوں کی فطرت کی بنیاد پر قائم کیے ہیں اور بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ لِعُبُودِہُمْ عَلٰی الْبَعْضِ (بوجہ اس کے کہ اللہ نے مرد کو عورت پر فضیلت دی ہے) الفاظ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی فرما دیا ہے۔ اب اگر یہ ایک امر واقعہ ہے کہ نہ عورت مرد کی فطرت اختیار کر سکتی ہے اور نہ مرد عورت کی فطرت اختیار کر سکتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہی نکلتا ہے کہ یہ حقوق و فرائض بھی قابل انتہال نہ ہوں اگر دھاندلی کر کے ان کو تلبیٹ کرنے کی کوشش کی گئی، جن حقوق کو مرد ہی کے لیے استعمال کرنا موزوں تھا وہ عورت کے سپرد کر دیئے گئے، یا جن ذمہ داریوں کے لیے عورت ہی موزوں ہو سکتی تھی وہ اٹھا کر مرد پر ڈال دی گئیں تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا کہ ہمارا سارا عالمی نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ ان دو اصولی باتوں کے بعد اب طلاق کی تفویض کے مسئلہ کو سمجھئے اور اس پر

مختلف پہلوؤں سے غور کیجئے۔

۱۔ میں تھوڑی دیر کے لیے اس بات کو صحیح تسلیم کیے لیتا ہوں کہ ایک مرد اگر اپنی بیوی سے یہ کہہ بیٹھے کہ طلاق نفی شدت (نیک نخت، جاتو جب چاہو اپنے اوپر تین طلاقیں وارد کر لیجیو) تو عورت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ زندگی میں جب چاہے اپنے اوپر تین طلاقیں وارد کر کے میاں کے گھر سے رخصت ہو جائے، لیکن کیا کتاب و سنت کا وظیفہ پڑھنے والے ارکان مکیشین اور ایک مجلس کی تین طلاقیں کے نفاذ کو عدتِ سنت قرار دینے والے یہ فقہائے گرامی یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے طلاق کا مسنون طریقہ امت کو ہی سکھایا ہے، کیا قرآن و حدیث میں نکاح کا یہی طریقہ بتایا گیا ہے کہ ہر مرد نکاح کے وقت ایک معیاری نکاح نامہ میں طلاق نفی شدت لکھ کر اس پر اپنا انگوٹھا ثبت کر دیا کرے، ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ بات اگر کہہ سکتا ہے تو ایک عورت بیزار شخص ہی کہہ سکتا ہے جس کو بیوی کے چھوڑنے یا رکھنے کی کوئی پروا نہ ہو، بلکہ وہ چاہتا ہو کہ جب بھی اس کا جی چاہے وہ دفع ہو جائے۔ اس کے اس قول پر اس پہلو سے تو غور ہو سکتا ہے کہ اس طرح عورت کو اپنے اوپر طلاق وارد کر لینے کا اختیار حاصل ہو گیا یا نہیں۔ لیکن یہ تو کسی عاقل آدمی کے ذہن میں خیال بھی نہیں گزر سکتا کہ اس طرح کے بیزارانہ قول کو ایک اصولِ دین قرار دے کر اس کو ایک معیاری نکاح نامہ میں ثبت کر دیا جائے اور پھر پوری مسلمان قوم کے ہر نکاح کرنے والے مرد سے اس پر انگوٹھے لگوا لیے جائیں۔ کیا جو نکاح مودت اور سکینت کی سب سے بڑی بنیاد تسلیم کیا گیا ہے اور جس کے توڑنے کو اسلام نے انتہائی کراہت کے ساتھ گوارا کیا ہے اس کو ارکان مکیشین یہ شکل دینا چاہتے ہیں کہ اس کا آغاز ہی میاں اور بیوی کی طرف سے اظہارِ بیزاری سے ہو، اور جو طریقہ طلاق کے لیے بھی ایک نہایت غلط اور بھونڈا طریقہ ہے وہ نہ صرف طلاق کے لیے بلکہ

نکاح کے لیے بھی ہمارے ملک میں اختیار کر لیا جائے ؟ اور ہر نکاح کا آغاز ہی طلاق کے نحو سے انتظام سے ہو ؟

۲۔ دوسری بات یہ کہ اگر شرح وقایہ کے اس جزئیہ کو ایک اساس دین کا درجہ دے بھی دیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عورت کس حیثیت سے اس اختیار کو استعمال کرے گی ؟ اگر اس حیثیت سے استعمال کرے گی کہ مرد نے اپنا حق طلاق عورت کو تفویض کر دیا ہے تو پھر مرد کے پاس حق طلاق کہاں باقی رہا۔ اس نے تو اپنا حق عورت کے حوالہ کر دیا۔ اب اگر مرد طلاق دینے کی ضرورت محسوس کرے (اور بعض جانتے سمجھنے والے بھی ہیں جن میں مرد پر بیوی کو طلاق دینا واجب ہو جاتا ہے، تو ایسی صورت میں یہ حضرت کیا کریں گے ؟ کیا شادی بیاہ کی عدالت میں خلع کی درخواست لے کر جائیں گے کہ خدا کے لیے میری بیوی سے مجھے چھڑاؤ میں اس کے جبر سے باز آیا ؟ یا اسی بیوی کے ساتھ مجھ کو زندہ بندھے رہیں گے اگرچہ وہ کھلم کھلا دوسروں سے آشنائی کرتی پھرے۔ اور اگر یہاں تک معترض ہوں تو تھوڑی سی ان کی مرست بھی کر دیا کرے ؟ اگر کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ یہ حق طلاق شوہر کو بھی حاصل رہے گا تو میرے نزدیک یہ تفویض نہیں ہوئی بلکہ ایک مستقل تشریع ہوئی، جس کا حق امتداد رسول کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں۔ طلاق کا حق قرآن نے تو صرف مرد کو دیا ہے اور یہ حق جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، عورت کی طرف منتقل کیے جانے کے لائق نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ جس طرح ایک شخص نکاح کے معاملہ میں کسی شخص کو اپنا وکیل بنا سکتا ہے۔ اسی طرح طلاق کے معاملہ میں بھی وہ کسی کو اپنا وکیل بنانے کا مجاز ہے اس وجہ سے اگر اس نے بیوی کو اپنا وکیل بنا دیا تو یہ وکیل کی صورت ہوگی اور یہ جائز ہے۔ اس وکیل پر مجھے کئی اعتراض ہیں۔

اول تو یہ کہ احکامات کے نزدیک کسی شخص کے لیے کسی شخص کو وکیل بنانا صرف اس صورت میں

جائز ہے جب کہ وہ بیماری یا غیر حاضری یا کسی دوسرے مانع کے سبب اپنے معاملہ کی ذمہ داری سے خود عہدہ براہ کرنے کے پوزیشن میں نہ ہو۔ اگر ایک شخص خود برسر موقع موجود ہے، تندرست ہے اور اپنی ذمہ داری کو خود بحسن و خوبی انجام دے سکتا ہے، تو اس کے کسی دوسرے کو وکیل بنانے کے کیا معنی ؟ آخر اس نے کس وجہ سے عورت کو طلاق دینے کے لیے اپنا وکیل بنایا ہے ؟ کیا اس معاملہ کو انجام دینے کے لیے مرد برسر موقع موجود نہیں ہے ؟ یا اس کی زبان گنگ ہے ؟ یا طلاق دنیا کوئی ایسا مشکل فن ہے جس کے لیے مرد کے پاس کافی قابلیت نہیں ہے اور عورت اس میں جہارت رکھتی ہے ؟

دوسرا یہ کہ نکاح کے معاملہ میں عورت کو وکیل بنانا مالکیہ اور شوافع کے نزدیک ناجائز ہے۔ اگر نکاح کے معاملہ میں ناجائز ہے۔ تو میرے نزدیک طلاق کے معاملہ میں اس کی وکالت بدرجہ اولیٰ ناجائز ہونی چاہیے۔ بالخصوص جب کہ وہ طلاق اسے اپنے ہی اوپر وارد کرتی ہے۔ اس شخص سے بڑھ کر کون اتنی ہو سکتا ہے جو اپنے مدعا علیہ کی کو اپنے مقدمہ میں اپنا وکیل بنالے۔

تیسرا یہ کہ عورت کو اپنا وکیل بنا دینے کے بعد مرد حق طلاق کو اس وقت تک استعمال نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ وکیل کو معزول نہ کر دے یا وکیل اس کو اس کا حق واپس نہ کر دے۔ جو صورت کمیشن نے تجویز کی ہے اس میں وکیل کی معزولی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور اگر عورت یہ حق مرد کو واپس کر دے تو پھر اس کے پاس حق طلاق باقی نہیں رہتا اور اگر نہ واپس کرے تو مرد اس حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ پھر طلاق کے معاملہ میں عورت اور مرد کے درمیان مساوات کہاں ہوئی ؟

تیسری بات یہ کہ معاہدہ نکاح میں یہ شرط کس نوعیت سے داخل کی جائے گی ؟

کیا ہر مرد کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی بیوی کو حق طلاق تفویض کرے؟ یا یہ شرط اختیار کی ہوگی جس کا جی چاہے تفویض کرے، جس کا جی نہ چاہے وہ تفویض نہ کرے؟ اگر دوسری صورت ہے تو ہمارے معاشرے میں ایسے احمق مرد بہت کم نکلیں گے جو خود اپنے پاؤں میں یہ کھارڈی خود اپنے ہی ہاتھوں مارنے پر راضی ہوں گے؟ اور اگر یہ شرط جبری ہوگی، ہر مرد کے لیے ضروری ہوگا کہ یہ شرط معاہدہ نکاح میں تسلیم کرے، تو یہ طلاق تفویض نہیں ہوئی بلکہ یہ طلاق مکروہ ہوگئی کیونکہ مرد کو اس بات پر مجبور کیا گیا ہے کہ وہ طلاق کا اختیار، جو از روئے شرع صرف اسی کو حاصل ہے، اپنی بیوی کے حوالے کر دے۔ یہ طلاق مکروہ دہی شے ہے جس کے خلاف حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جابر عباسی خلیفہ کے مقابل میں صدائے احتجاج بلند کی۔ اور اس جرم میں ان کی مشکلیں کس کے لشیر و تذلیل کے ارادہ سے ان کو اونٹ پر سوار کرایا گیا لیکن یہ امام جلیل بچائے اس کے کہ اس ابتلا سے بچت بچت اور مرعوب ہوتے اعلان حق کے لیے اونٹ پر تن کر کھڑے ہو گئے اور تاریخ میں یاد رہ جانے والا یہ فقرہ فرمایا کہ ”جو مجھے پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہے، جو نہ پہچانتا سو وہ اب پہچان لے، میں مالک بن انس ہوں اور یہ اعلان کرتا ہوں کہ طلاق مکروہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کے بعد ان کی مشکلیں اس زور کے ساتھ کسی گئیں کہ ان کے بازو چڑچڑا اٹھے۔

ممکن ہے کسی صاحب کو یہ خیال ہو کہ آخر طلاق مکروہ بھی تو بعض فقہاء کے نزدیک جائز ہے، پھر کیا مضائقہ ہے؟ اگر ہم اپنے عائلی نظام کی بنیاد اسی پر قائم کر لیں۔ ان کے اطمینان کے لیے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جو اس کو جائز سمجھتے ہیں وہ بھی ہر شکل میں اس کو جائز نہیں سمجھتے بلکہ صرف اس صورت میں جائز سمجھتے ہیں جب قانون اور عدالت سے اس اکراہ کا

مدعا ممکن نہ ہو، مثلاً یہ کہ کوئی مستبد حکمران کسی کو مجبور کر کے اس کی بیوی کو طلاق دلوائے ایسی صورت میں اس کو جائز قرار دینے والوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر اس کو جائز نہ قرار دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس عورت کا کسی بھی دوسرے شخص سے نکاح زنا کے حکم میں ہے۔ اور اس سے جو اولادیں پیدا ہوں وہ سب حرامی بھڑی ہیں۔ عورت کو اس مفسدہ سے بچانے کے لیے بعضوں نے اس کو جائز قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ یہ نقطہ نظر صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ جو مرد یا عورت مکروہ کے حکم میں ہے اس کے اوپر جہاں تک آخرت کا تعلق ہے وہاں تو کوئی مواخذہ ہے نہیں۔ رہے دنیا کے معاملات تو ان میں اگر اس کے سبب سے کوئی مفسدہ پیدا ہوتا ہے تو پیدا ہوا کرے۔ چند افراد کو ایک فرضی مفسدہ سے بچانے کے لیے پوری قوم کے لیے مفسدہ کا دروازہ کھول دیا گیا۔

ہم اگر طلاق مکروہ کسی مذہبی فقہی میں مطلقاً بھی جائز ہو تو اس کا جائز ہونا اور چیز ہے اور اسے ایک مطلوب شے قرار دے کر دنیا کے ہر مرد پر از روئے ضابطہ مسلط کر دینا اور شے۔ کیا کسی مذہبی فقہی میں یہ بھی جائز ہے؟

۴۔ اگر طلاق تفویض کا یہ طریقہ چل پڑے تو ہماری گھر کی زندگی کا جو نقشہ بنے گا آج کل تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ مرد اگر طلاق دیتا ہے تو اس کو اس معاملہ کے ہزار پہلو سوچنے پڑتے ہیں۔ سب پہلے اس کے سامنے اپنی عزت و شہرت (جس کی کچھ بھی وہ ہے) کا سوال آتا ہے، اگر بچے ہیں تو بچوں کی پرورش و تربیت کا مسئلہ آتا ہے اور یہ مسائل اس کے لیے اتنے اہم ہوتے ہیں کہ حجت تک وہ انتہائی حد تک مجبور نہ ہو جائے بیوی کو طلاق دینے کی جرأت نہیں کرنا۔ لیکن اگر یہ حق اس نے سیکم صاحبہ کی طرف منتقل کر رکھا ہے تو کوئی ذرا سی بات بھی سیکم صاحبہ کو اس قدر پریم کر دے سکتی ہے کہ وہ اپنے اوپر تین طلاقیں وارد کر کے چل کھڑی ہوں۔ کیونکہ نہ تو ان کو مہر ادا کرنا،

نہ زمانہ عدت کا خرچ برداشت کرنا ہے۔ نہ چھوٹے بچوں کے زمانہ حضانت و رضاعت کی کفالت کا کوئی باران کے اوپر ہے۔ وہ تو کچھ کھومیں گی نہیں بلکہ طلاق کے بیچ میں کچھ نہ کچھ مرد سے وصول ہ کرے گی۔ مرد غریب پر تو کمیشن نے یہ پابندی بھی عائد کرنی چاہی ہے کہ وہ اگر طلاق دے تو کسی عدالت میں حاضر ہو کر اس کا کوئی معقول سبب بتائے اگر نہ تہسکے تو عدت کے نکاح ثانی یا اس کے عین حیات تک کے لیے اس کی کفالت کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ عدت پر کمیشن نے اس قسم کی بھی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے اور دوسرے بھی کیوں؟ مردوں کو تو عدالت سے فیصلہ حاصل کرنے کا پابند اس وجہ سے کیا جا رہا ہے کہ طلاق کے معاملہ میں ان کی بے احتیاطی کا پورا پورا تجربہ کمیشن کو ہو چکا ہے۔ عورتوں کے بارہ میں یہ پورا اطمینان ہے کہ نہ انھوں نے کوئی کام کبھی بے احتیاطی سے کیا ہے نہ آئندہ کوئی اندیشہ ہے کہ اگر طلاق کی تلوار ان کے ہاتھ میں پکڑا دی گئی تو وہ کبھی اس کے استعمال میں بے احتیاطی برقیں گی۔

ایک مجلس کی تین طلاقیں | کمیشن کی سفارش یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں جو دے دی جاتی ہیں وہ بائن نہ قرار دے دی جائیں، بلکہ ان کو ایک ہی شمار کیا جائے اور یہ قانون نافذ کیا جائے کہ از روئے قانون دی طلاق جائز شمار کی جائے گی جو تین طہروں میں الگ الگ دی گئی ہو۔ کمیشن نے اپنی اس سفارش کی تائید میں حضرت ابن عباسؓ کی وہ مشہور روایت نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک، حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دور امارت اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور خلافت تک ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں۔ لیکن حضرت عمرؓ کے دور میں جب لوگ طلاق کے معاملہ میں جلد بازی اور بے احتیاطی برتنے لگے تو انھوں نے بطور تعزیر اس طرح دی ہوئی طلاقیں کو بائن قرار دے دیا۔

کمیشن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے خواہ کسی مصلحت سے یہ بات کی ہو، یہ دین میں ایک بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ کمیشن کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ بعد میں حضرت عمرؓ اپنے اس فعل پر نادم بھی ہوئے اور انھوں نے خود اس بات کا اقرار کیا کہ ان کو دین میں اس طرح کی کسی ایجاد کا حق نہیں تھا اور یہ کہ اس سے لوگوں کو طلاق کے معاملہ میں بڑی دھیل حاصل ہو گئی۔ اس مسئلہ کی بابت میری گزارشات حسب ذیل ہیں:-

ایک مجلس کی تین طلاقیں کے بائن ہونے پر نہ صرف چاروں ائمہ متفق ہیں بلکہ اکثر صحابہؓ، جہو زنا لعین اور جہو زنا سب متفق ہیں۔ یہی مذہب خلفائے راشدین میں سے حضرت عثمانؓ کا ہے۔ یہی مذہب حضرت علیؓ کا ہے اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہی مذہب خود ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی ہے جن کی روایت کی بنا پر کمیشن نے اس مذہب کو بدعت ضلالت قرار دیا ہے۔ قابل ذکر لوگوں میں سے ایک ابن حزم اس کے مخالف ہیں اور متاخرین میں سے امام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انہی دونوں جلیل القدر بزرگوں کی مخالفت نے اس مخالف مذہب میں ایک جان ڈالی ورنہ اس کے خلاف کوئی ایسی آواز سلف یا خلف میں موجود نہیں تھی جس کو کوئی خاص اہمیت حاصل ہو۔ میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے گہری عقیدت رکھتا ہوں تاہم اس عنوان پر استاد اور شاگرد دونوں کی تحریریں تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد میں نہایت ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا ہوں کہ کتاب سنت کی روشنی میں جہود کا مذہب اپنے اندر زیادہ قوت رکھتا ہے۔

اس باب میں جو احادیث وارد ہیں ان کے مطالعہ سے یہ دعویٰ تو بالبداهت غلط معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے عہد مبارک میں ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں۔ حدیثیں دونوں طرح کی ملتی ہیں۔ زیادہ لمبی میں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک مجلس کی تین یا تین سے

زائد طلاؤں کو بائن قرار دیا گیا اور بعض ایسی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تین طلاؤں کو ایک کی
شمار کیا گیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس باب کی حدیثوں میں یہ اختلاف کیوں ہے کیا
ایک ہی معاملہ میں حضور نے اعباد بائند مختلف اوقات میں مختلف فیصلے فرمادیے۔ یا اس
اختلاف فیصلہ کی کوئی ایسی وجہ موجود ہے جس کے واضح ہو جانے کے بعد دونوں طرح کی حدیثوں
کے الگ الگ محل متعین ہو جاتے ہیں؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں طرح کی حدیثیں
دو مختلف نوعیت کی طلاؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی شخص اٹھتا ہے
اور عدد کی تصریح کے ساتھ اپنی بیوی کو مخاطب کر کے یہ کہہ دیتا ہے کہ تجھ پر تین طلاقیں یا تین
ہزار طلاقیں یا اتنی طلاقیں جتنے آسمان میں ستارے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص
عدد کی تصریح تو نہیں کرتا لیکن تین مرتبہ تجھے طلاق ہے۔ طلاق ہے، طلاق ہے کے الفاظ
دہرا دیتا ہے۔ یا اس طرح طلاق دے دیتا ہے جس کو ہمارے فقہاء طلاق البتہ سے تعبیر کرتے
ہیں۔ ان میں سے پہلی صورت کے جتنے معاملات حضور کے سامنے آئے ان میں آپ نے طلاق کو
بائن قرار دیا بلکہ جن میں اعداد طلاق کا اسراف موجود تھا ان کے بارہ میں آپ نے طلاق دینے
والے کو مخاطب کر کے یہ ارشاد فرمایا کہ تیری بیوی کے جدا ہونے کے لیے تو ان بہت سی طلاؤں میں
سے صرف تین ہی کافی ہیں۔ بقیہ تیرے حساب میں لکھی جائیں گی اور یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ
انہیں معاف کرے یا ان کے سبب سے تجھے سزا ملے۔ دہی دوسری صورت تو اس طرح کے جو معاملات
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوئے ان میں حضور نے طلاق دینے والی کی نیت دریافت کی
کہ فی الحقیقت اس طرح کہنے سے اس کا منشا کیا تھا، پس نظر صرف ایک طلاق دنیا تھا،
لفظ کا اعادہ محض اظہار تاکید کے لیے تھا، یا وہ فی الواقع تین طلاقیں دنیا چاہتا تھا۔ فاعل
نے اگر قسم کے ساتھ جواب دیا کہ وہ صرف ایک ہی طلاق دنیا چاہتا تھا تو اس کی نیت کی بنا پر حضور نے

اس کی طلاق کو رسمی قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طلاق کا معاملہ نہایت اہم ہے۔ اگر طلاق
دینے والے کے قول میں ادنیٰ گنجائش بھی اس بات کی موجود ہے کہ اس کی طلاق کو طلاقِ رسمی
پر محمول کیا جاسکے تو اس کا فائدہ اسے حاصل ہونا چاہیے لیکن اگر نیت کی بحث کی کوئی گنجائش ہی
اس نے نہیں چھوڑی ہے، بلکہ صاف الفاظ میں عدد کی تصریح کے ساتھ طلاق دی ہے تو شریعت
اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ طلاق اور نکاح کے الفاظ مذاق بنا کر رکھ دیئے جائیں۔

مسئلہ کی یہ نوعیت خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تھی۔ اب آئیے اس سوال
پر غور کیجئے کہ اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ کیا تبدیلی کی جس کا ذکر حضرت ابن عباس نے
اپنی روایت میں فرمایا ہے۔ انھوں نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ ہے کہ جب ان کے سامنے بکثرت معاذ
طلاق کے ایسے آئے جن میں ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دینے کی بداحتیاطی کی گئی تھی تو انھوں نے
مذکورہ دونوں قسم کی طلاقیں خواہ عدد کی تصریح کے ساتھ دی گئی ہوں یا محض تکرار الفاظ کے
ساتھ، نیت اودارادہ کا سوال چھیڑے بغیر نافذ کر دیں۔ سیاستِ دین کی رُو سے اس چیز کا ان کو
پورا پورا اختیار حاصل تھا کیونکہ یہ نیت کا سوال محض ایک رعایت ہے جس سے وہ لوگ تو فائدہ
اٹھانے کا حق رکھتے تھے جو کم علمی اور بے خبری کے سبب ایسا اتفاقیہ کر گزرتے تھے، لیکن
جب بار بار کی تاکید و تنبیہ کے بعد بھی لوگ باز نہیں آ رہے تھے، بلکہ اس چیز نے ایک فتنہ
کی صورت اختیار کر لی تھی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سابق طریقے کو بدل دینا ضروری سمجھا۔ اس فتنے
کو بڑھانے میں اس امر کو بڑا دخل تھا کہ ایک مجلس میں دی ہوئی طلاؤں کی بعض صورتیں ایسی بھی
تھیں جن میں معاملہ کا سارا انحصار طلاق دینے والے کی نیت پر رہ گیا تھا۔ ایک شخص جن
الفاظ اور جس نیت سے بھی طلاق دے وہ اگر نیک نیت اور صادق القول نہ ہو تو بڑی آسانی
کے ساتھ اس پر وہ میں اپنے آپ کو چھپا سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس طریقہ طلاق میں

بہت بے باک ہو گئے۔ طلاق کا لفظ ایک مذاق بن کے رہ گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب اس فتنہ کی شدت پوری طرح محسوس کر لی تو اس کا دروازہ بند کر دیا اور ہر طرح کی طلاقوں کو نافذ کر دیا۔ چونکہ اس کی مصلحت بالکل واضح تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک ایسا دروازہ بند کیا تھا جس کو بند ہی ہونا چاہیے تھا اس وجہ سے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم ان کی رائے سے اتفاق کیا اور اس پر ایک خلیفہ راشد کی رہنمائی میں تمام اہل علم کا اجماع ہو گیا۔

آخر بار بار کی تفہیم اور تاکید کی ممانعت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے باوجود کہ ایلعب بکتاب اللہ واما بین اظہر کلمۃ کتاب اللہ کے ساتھ یہ مذاق، میری موجودگی میں؟) لوگ اس طریقہ طلاق میں جو اتنے دلیر ہوتے جارہے تھے اس کی وجہ یہی تھی کہ بہتوں نے بیوی پر غصہ نکالنے کا اس کو ایک ذریعہ بنا لیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس وقت تو ہم نے طلاق غلط کی دھونس جادی ہے بعد میں اگر ضرورت محسوس ہوئی تو کہہ دیں گے کہ ہم تو صرف تاکید کے لیے طلاق کا لفظ دہرایا تھا، مقصود تین طلاقیں دینا نہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تو کسی مسلمان کے لیے اپنے امادہ کے متعلق غلط بیانی آسان نہ تھی۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عہد میں ہر شخص کے بارہ میں یہ سن ظن کیے کر سکتے تھے کہ وہ ضرور سچ ہی کہتا ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے دونوں قسم کی طلاقوں کو، اس کو بھی جو عدد کی تصریح کے ساتھ دی گئی ہو اور اس کو بھی جو محض لفظ طلاق کی تکرار کے ساتھ دی گئی ہو، ایک ہی درجہ میں رکھا اور دونوں کو نافذ کر کے ہر شخص پر یہ وضع کر دیا کہ اب ایک مجلس میں تین طلاقیں جس شکل میں بھی دی جائیں گی وہ نافذ ہو جائیں گی، کسی کے لیے یہ کہنے کا موقع باقی نہیں رہا کہ میں نے صرف طلاق طلاق کا لفظ دہرایا تھا، نیت طلاق بائن کی نہ تھی۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ بدعت ہے اور بدعت بھی بدعتِ ضلالت ہے؟ اگر یہ بدعت ہے تو تمام صحابہ و تابعین اور تمام ائمہ و فقہاء اس پر کس طرح متفق ہو گئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت عمر کو یہ کس طرح موقع دے دیا کہ انھوں نے اپنی بڑی بدعت کر ڈالی اور کسی کے کانوں پر جو بھی نہیں رنگی۔ حضرت عمر کوئی متعبد بادشاہ نہ تھے، کمیشن کو خود اقرار ہے کہ ایک عورت بھی برسرِ مہر ان کو ٹوک دیتی تھی اور وہ بڑی فیاضی اور خوش دلی کے ساتھ اس کی بات سننے اور اس کو قبول کر لیتے تھے۔ ایک ایسے مثالی عہد میں یہ کس طرح ممکن ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک اتنی بھاری بدعت کو گزریں اور لوگ چپ چاپ دیکھتے رہیں۔ کوئی زبان اس کے خلاف نہ کھلے۔ پھر لطف یہ کہ صرف ایک ہی خلیفہ راشد نہیں بلکہ بعد کے دونوں خلفاء بھی اس پر متفق اور ان کے زمانوں کے تمام علماء و فقہاء بھی اس پر مطمئن رہے۔ اگر یہ بدعت ہے تو اس کے معنی تو یہ ہونے لگے کہ یہ پوری امت العباد بائیں ایک بدعتِ ضلالت پر متفق ہو گئی۔ در آنحالیکہ حدیث میں آیا ہے کہ یہ امت ضلالت پر کبھی متفق نہ ہوگی۔

پھر یہ بیان بھی عجیب و غریب ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعد میں اپنے اس فیصلہ پر نادم ہوئے تھے۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو آخر انھوں نے ندامت محسوس کئے ہی اس فیصلے کو بدل کیوں دیا؟ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ ای اور ہٹ دھرم تھے کہ دین کے معاملے میں اپنی ایک غلطی عکس کر کے بھی اس پر جے رہے؟ اور اگر کسی وجہ سے انھوں نے اس غلطی کی تلافی نہ کی تھی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیوں نہ اس کی اصلاح کی؟

حسن لوگوں نے اس کو طلاق بدعی کہا ہے انھوں نے ہرگز اس سے وہ بدعت مراد نہیں لی ہے جس کو کمیشن نے بدعتِ ضلالت (UNDESIRABLE INNOVATION) قرار دیا ہے بلکہ اس سے ان کی مراد طلاق کا وہ طریقہ غیر اسلامی (UN-ISLAMIC) قرار دیا ہے بلکہ اس سے ان کی مراد طلاق کا وہ طریقہ

ہے جو اگرچہ جائز تو ہے لیکن معیاری سنت سے ہٹا ہوا ہے۔

دین کے اکثر احکام کے بجالانے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو وہ طریقہ ہے جس طریقہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کام کو انجام دیا ہے۔ یا انجام دینے کی ہدایت فرمائی ہے۔ یہ معیاری اور مثالی طریقہ ہے اور دوسرا طریقہ وہ ہے جس طریقہ پر اگر وہ انجام لے دیا جائے تو اگرچہ وہ دین میں حد جواز کے اندر تو آجائے گا لیکن معیاری طریقہ پر انجام نہ پانے کے سبب وہ صحیح طریقہ سنت سے ہٹا ہوا سمجھا جائے گا۔ چونکہ دین میں مطلوب معیاری سنت ہے اس وجہ سے اہل علم و تقویٰ اپنے اپنے دائرہ کے اندر اس کی اصلاح کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر وضو کو لیجیے اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی نیت اور ہم اللہ کے ساتھ وضو کا ارادہ کرے۔ پہلے دونوں ہاتھ دھوئے، پھر کلی کرے اور ناک میں پانی ڈالے پھر تین تین مرتبہ اتھام کے ساتھ ترتیب اور تسلسل کو ملحوظ رکھتے ہرے اعضائے وضو کو دھوئے۔ پھر پوئے سر کا مسح کرے، پھر پاؤں دھوئے اور اس بات کا خیال رکھے کہ ایڑیوں کا کوئی حصہ خشک نہ رہے پائے، پھر وضو کی دعا پڑھ کر وضو کو تمام کرے۔ یہ وضو کا معیاری طریقہ ہوا۔ اس کی ایک دوسری شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آدمی مذکورہ باتوں میں سے بعض مستحبات کو ترک کر دے، یا ترتیب میں کچھ گڑبڑ کر دے، یا سر کے مسح کے معاملہ میں پورا اتھام نہ کرے۔ صرف سر کے ایک تلیل حصہ ہی کا مسح کر کے چھوڑ دے۔ وضو مرنے کو تو اس طرح بھی ہو جائے گا لیکن معیاری سنت کے خلاف ہوگا۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حجتہ الوداع کی تفصیلات پر بھی تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک توجہ کا وہ طریقہ تھا جس طریقہ پر خود حضورؐ نے یا صاحب علم صحابہؓ نے حج کیا اور ایک طریقہ وہ تھا جس طریقہ پر ان لوگوں نے حج کیا جن کو مناسک حج کی پوری تفصیلات کا اچھی طرح علم نہیں تھا۔ اس طرح کے کتنے لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے

مناسک کی ادائیگی کے معاملہ میں اپنی مختلف کوتاہیوں یا ترتیب کی غلطیوں کا ذکر کیا۔ اپنے ن کی غلطیوں کی تو اصلاح فرمائی لیکن کسی کو یہ نہیں فرمایا کہ تمہارا حج ہی نہیں ہوا۔

اسی طرح طلاق دینے کا ایک طریقہ تو وہ ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو سکھایا ہے۔ یہ طریقہ معیاری طریقہ ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر اسی طریقہ پر طلاق دی جائے گی تب تو طلاق واقع ہوگی اور اگر اس طریقہ پر نہیں دی جائے گی تو سرے سے واقع ہی نہیں ہوگی۔ واقع تو اس طرح بھی ہو جائے گی، البتہ چونکہ معیاری طریقہ پر نہیں ہوگی اس وجہ سے ان ریکٹوں سے خالی ہوگی جو معیاری طریقہ میں موجود ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض مرتبہ جب آپ کے سامنے طلاق کے ایسے مقدمات آئے جن میں جلد بازی اور بے احتیاطی کی گئی تھی تو آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ طلاق واقع ہی نہیں ہوئی بلکہ یہ فرمایا کہ طلاق تو واقع ہوئی لیکن سنت کی خلاف ورزی ہوئی اور بعض مرتبہ اس طرح کے واقعات پر تنبیہ بھی فرمائی کہ یہ اللہ کی کتاب کے ساتھ مذاق ہو رہا ہے درآخالیکہ میں ابھی تمہارے اندر موجود ہوں۔

اب گویا طلاق کے دو طریقے ہوئے۔ ایک معیاری طریقہ، سنت کے ٹھیک ٹھیک مطابق اور دوسرا صحیح سنت سے تو ہٹا ہوا لیکن حد جواز کے اندر۔ تعبیر کرنے والوں نے جب ان دونوں کو الگ الگ تعبیر کرنا چاہا تو ایک کے لیے نو بنائی اصطلاح طلاق سنت کی مل گئی اس وجہ سے اس کو طلاق سنت سے تعبیر کر دیا۔ اب رہ گیا دوسرا، تو طلاق سنت کی اصطلاح کے مقابل میں دوسری اصطلاح طلاق بدعی ہی کی ہو سکتی تھی، چنانچہ اس کے لیے طلاق بدعی کی اصطلاح چلی پڑی۔ لیکن اس کے طلاق بدعی ہونے کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ یہ بدعت ضلالت ہے، بلکہ اس سے مراد طلاق کا وہ طریقہ ہے جو معیاری سنت سے

ہوا ہے۔ اگر بدعت سے مراد یہاں بدعت ضلالت ہوئی تو آخر وہ لوگ اس اصطلاح کو کیوں اختیار کر لیتے جو اس طریقہ طلاق کو بدعت نہیں سمجھتے بلکہ اس کے جواز کے قائل ہیں۔ ان کے اس تعبیر کو قبول کر لینے کی وجہ تو یہی ہو سکتی ہے کہ انھوں نے اس کو صرف ایک اصطلاحی بدعت سمجھا۔ اگر وہ اس کو حقیقی بدعت سمجھتے تو اس کے جواز کے قائل کس طرح ہوتے؟ یہ مسئلہ کی اصلی صورت ہے جو اس باب کی احادیث کے تدبر سے واضح ہوتی ہے جو شخص بھی غور کے ساتھ ان احادیث کا مطالعہ کرے گا ان اشارات سے ایسی نتیجہ تک پہنچے گا جس نتیجہ تک میں پہنچا ہوں۔

اب میں نیل الاوطار سے دونوں طرح کی حدیثیں یہاں پیش کیے دنیا ہوں ان حدیثوں پر اگرچہ مخالفین اور موافقین کی طرف سے بہت کچھ کہا بھی گیا ہے اور ان میں سے بعض کے اندر فی الواقع ضعف کے اسباب بھی موجود ہیں لیکن ان فنی اور اصطلاحی خامیوں کے سبب سے اس قدر مشترک پر کوئی اثر نہیں پڑتا جو ان حدیثوں کے مطالعہ سے مجموعی طور پر سامنے آتا ہے۔

پہلے وہ حدیثیں لیجئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک مجلس کی تین یا تین سے زائد طلاقیں کو بائن قرار دیا ہے۔

حسن سے روایت ہے کہ عید اللہ بن عمرؓ نے اپنی بیوی کو ایک طلاق حالت حیض میں دے دی۔ پھر ارادہ کیا کہ آئندہ وہ طہروں میں دو طلاقیں اور دے دیں گے۔ اس واقعہ کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو آپؐ نے فرمایا کہ اے ابن عمرؓ اللہ تعالیٰ نے اس طرح طلاق دینے کا حکم نہیں دیا ہے، تم نے سنت کے طریقہ کے خلاف کیا ہے، سنت یہ ہے کہ طلاق کے لیے طہر کا انتظار کرو، پھر ہر طہر میں ایک ایک طلاق دو، عید اللہ

بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اپنی بیوی سے مراجعت کر لی پھر اپنے فرمایا کہ جب وہ پاک ہو جائے تو چاہے طلاق دو چاہے رکھو۔ عید اللہ بن عمرؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ اگر میں نے اس کو تین طلاقیں دے چھوڑی ہوئی تو کیا میرے لیے اس سے مراجعت جائز ہوئی؟ حضورؐ نے فرمایا نہیں، تمہاری بیوی تم سے جدا ہو جاتی، اور اس طرح طلاق دنیا ایک معصیت ہوتا (دار قطنی)

”سہل بن سعد سے روایت ہے کہ جب بنی مملکان کے بھائی نے اپنی بیوی سے لعان کیا تو اس نے کہا یا رسول اللہ، میں بڑی ظالم ہوں گا، اگر اس کے بعد بھی اس کو بیوی بنائے رکھوں۔ سو اب میری طرف سے طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے (رداء احمد)

”عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ میرے دادا نے اپنی ایک بیوی کو بیک وقت ہزار طلاقیں دے دیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ تمہارے دادا نے خدا کا خوف نہیں کیا۔ ان میں سے تین کا اٹھیں حق تھا، بقیہ ۹۹۷ سب ظلم و زیادتی ہیں، اگر اللہ چاہے گا تو معاف کر دے گا اور اگر چاہے گا تو سزا دے گا“

ایک دوسری روایت میں یہی بات اس طرح بیان ہوئی ہے ”تمہارے باپ نے خدا کا خوف نہیں کیا کہ وہ اس کے لیے راہ پیدا کرنا۔ اس کی بیوی تین طلاقیں سے اس سے جدا ہو گئی اور یہ بات سنت کے خلاف ہوئی۔ ۹۹۷ طلاقیں اس کی گردن میں ہوں گی“ (بحوالہ مصنف عبد الرزاق)

جو لوگ اس مذہب کے مخالف ہیں اور کہتے ہیں کہ اس طرح طلاق دینے سے ایک ہی طلاق پڑتی ہے۔ ان کا اعتماد دو حدیثوں پر ہے۔ ان میں سے ایک کانہ بن عبد اللہ

والی حدیث ہے جس کا حوالہ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بھی دیا ہے اس حدیث کا مضمون دو طریقوں سے بیان ہوا ہے۔

ایک سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تین طلاقیں دی تھیں۔ لیکن ان کی نیت معلوم کرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تین طلاقوں کو ایک ہی قرار دیا۔ اسی واقعہ کی روایت ابو داؤد اور دارقطنی میں اس طرح ہے کہ یہ طلاق البتہ کی صورت میں تھی جس میں فیصلہ کا انحصار طلاق دینے والے کے قصد و نیت پر ہوتا ہے۔ چونکہ رکات نے قسم کھا کر حضور کے سامنے یہ کہا کہ وہ ایک ہی طلاق کا ارادہ رکھتے تھے اس وجہ سے حضور نے ان کی طلاق کو حبی قرار دیا۔ ابو داؤد میں یہ روایت مندرجہ ذیل طریقہ پر ہے اور اس کو انھوں نے حسن صحیح کا درجہ دیا ہے :-

”رکات بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ انھوں نے اپنی بیوی کو طلاق البتہ دے دی اور جا کر اٹھنے کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ خدا کی قسم میری مراد ایک طلاق سے زیادہ نہ تھی۔ حضور نے فرمایا قسم کھاتے ہو کہ تم نے ایک سے زیادہ کا ارادہ نہیں کیا تھا؟ رکات نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میں نے ایک سے زیادہ کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیوی ان کو واپس کرادی۔“

۱۔ طلاق البتہ کا مطلب یوں سمجھئے کہ جیسے کوئی شخص اپنی بیوی سے یوں کہہ بیٹھے کہ تجھ کو قطع طلاق ہے، اس صورت میں طلاق دینے والے کی نیت دریافت کی جائے گی۔ اگر وہ کہے کہ میں نے قطع طلاق لفظ سے تین طلاقیں مراد لی تو یہ طلاق بائن ہوگی اور اگر وہ کہے کہ قطع طلاق اس نے محض تاکہ اور زور پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا ہے، مقصود ایک طلاق سے زیادہ نہیں ہے تو یہ طلاق رجعی ہوگا

دوسری روایت حضرت ابن عباسؓ کی وہ مشہور روایت ہے جس کا حوالہ ہم بحث کے آغاز میں دے چکے ہیں۔ اس کا مضمون یہ ہے :-

”طاؤس حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں، نیز حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں تک تین طلاقیں ایک ہی سمجھی جاتی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ لوگ ایک ایسے معاملہ میں بڑی جلد بازی سے کام لینے لگے ہیں جس میں ان کو صبر اور انتظار کی ہدایت کی گئی تھی تو ہم ان کی طلاقیں نافذ کیوں کریں؟ اگر اس کا مطلب یہ دیا جائے کہ تین طلاقیں خواہ کسی صورت میں دی گئی ہوں حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ تک ایک ہی سمجھی جاتی تھیں تب تو یہ روایت بلاشبہ اوپر والی ان حدیثوں کے خلاف پڑتی ہے جن سے تین طلاقوں کا بائن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن ابو داؤد میں یہ جن الفاظ میں وارد ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غیر مدخلہ بیوی سے متعلق ہے اور بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ یہ اس صورت سے متعلق ہے جب طلاق دینے والا عدل کی تصریح کے بغیر محض لفظ طلاق کی تین مرتبہ تکرار کر دے۔ اگر ان دونوں میں سے کسی صورت پر بھی اس کو ختم کر دیا جائے تو یہ اوپر کی حدیثوں کے ساتھ جمع ہو جاتی ہے۔“

یہ امر بھی خاص طور پر نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ حضرت ابن عباسؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں خود ایک مجلس کی تین طلاقوں کو بائن مانتے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں راوی کی روایت دیکھنی چاہیے نہ کہ اس کا مذہب۔ لیکن یہ بات انصاف کے خلاف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ جیسے فقیہ صحابی اگر ایک طرف یہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اور حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں تین طلاقیں ایک سمجھی جاتی تھیں، اور پھر فتویٰ اس کے خلاف دیتے ہیں تو یہ صاف دلیل ہے

اس بات کی کہ ان کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو تین طلاقیں ایک کبھی جاتی تھیں یا تو لفظ طلاق کی تکرار دلی ہوتی تھیں یا غیر مدخلہ بیوی سے متعلق۔ تین طلاقیں کی جو عام صورت ہے اس سے متعلق ان کا یہ بیان نہیں ہے، حضرت ابن عباس کے مذہب کے بارہ میں مندرجہ ذیل روایات ملاحظہ ہوں۔

مجاہد سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں ابن عباس سے پاس موجود تھا کہ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں یہ سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہے ان کی خاموشی سے میں نے گمان کیا کہ شاید وہ اس طلاق کو رجعی قرار دیں گے۔ لیکن انھوں نے فرمایا کہ لوگ پہلے حماقت کر گزرتے ہیں اس کے بعد یہاں آکر اے ابن عباس! اے ابن عباس! پکارا میں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو اس سے ڈرتا ہے وہ اس کے لیے راہ پیدا کرتا ہے۔ تم چونکہ اس کے نہیں ڈرتے اس وجہ سے میں تمہارے لیے کوئی راہ بھی نہیں پا رہا ہوں۔ تم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور تمہاری بیوی تم سے جدا ہو گئی (البداد)

مجاہد سے روایت ہے کہ ابن عباس سے ایک ایسے شخص کے بارہ میں فتویٰ پوچھا گیا جو نے اپنی بیوی کو اکٹھی سو طلاقیں دے چھوڑی تھیں۔ انھوں نے طلاق دینے والے سے مخاطب ہو کر کہا کہ تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی (یعنی قرآن کے بتائے ہوئے طریقہ کے خلاف طلاق دی اور اپنی بیوی سے محروم ہوا، تم خدا سے ڈرے نہیں ورنہ وہ تمہارے لیے راہ پیدا کرتا)۔

سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دے دیں حضرت ابن عباس سے فتویٰ پوچھا گیا تو انھوں نے طلاق دینے والے کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تیری بیوی کے جدا ہونے کے لیے تو ان میں سے صرف تین کافی ہیں، ۹۹۷ تیرے پاس بچ رہیں گی۔

انہی سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے

اپنی بیوی کو آسمان کے تاروں کی تعداد میں طلاق دے دی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس سنت کے طریقہ کی خلاف ورزی کی ہے اور اس کی بیوی اس پر حرام ہو گئی (دارقطنی) ان تمام روایات پر اگر ایک شخص تطبیق کے ارادہ سے غور کرے گا تب تو یہ حقیقت اس پر اچھی طرح واضح ہو جائے گی جو ہم نے پیش کی ہے، اور اگر صرف ایک ہی قسم کی روایت کو لے کر قیاس کو نظر انداز کر دینا چاہے گا تو اس کے لیے اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ کو اور ان کے ساتھ ساتھ ساری امت کو مبتدع قرار دے۔

اب غور کیجیے کہ کمیشن کی سفارش اگر قانون کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ طلاق کا لفظ گھر گھر میں ایک سخن تنکھ بن کر رہ جائے گا۔ جو لفظ زبان نکالتے ہوئے آج ہر شخص ڈرتا ہے اور بہت دور تک اس کے نتائج پر غور کرتا ہے۔ وہ لفظ بات بات پر زبان سے نکلے گا اور بہت ممکن ہے کہ زیادہ عرصہ نہ گزرے کہ یہ شوہروں کی طرف سے بیویوں کے لیے ایک پیار کا کلمہ بن کے رہ جائے۔ پیغمبرؐ نے تو فرمایا ہے کہ یہ لفظ اگر مذاق سے ہی نکل جائے تو یہ حقیقت ہے لیکن ہمارے ہاں اس کی کوئی حقیقت نہیں رہ جائے گی۔ شوخص اٹھے گا معمولی بڑی پر بھی ایک ہی سانس میں دس ہزار طلاقیں دے ڈالے گا اور جب غصہ اتر جائے گا تو مسکرا کر کہہ دے گا کہ بیگم میں نے تو رجوع کر لیا ہے۔ ایک آدھ ماہ کے ناغہ کے بعد وہ پھر اسی طرح طلاق دے گا۔ اور پھر رجوع کر لے گا۔ الخرض ایک شخص اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے ہزار مرتبہ اپنی بیوی کو طلاق دے گا اور کتنے ہزار مرتبہ رجوع کرے گا، یہاں تک کہ کثرت استعمال سے یہ لفظ آنا بے معنی اور بے اثر ہو کر رہ جائے کہ معاشرہ میں طلاق اور غیر مطلقہ میں کوئی امتیاز ہی سرے سے باقی نہیں رہ جائے گا۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے ساتھ کھلا ہوا مذاق ہو گا۔ حضرت عمرؓ نے اسی

نفتہ کا دروازہ بند کیا تھا۔ اب اگر اس دروازہ کو چوڑا کھول دینا ہے تو کھول دیجیے۔ لیکن اس بات کو خوب یاد رکھیے کہ اس سے طلاق کی تعدادوں میں کمی نہیں ہوگی جیسا کہ گمان کیا جا رہا ہے۔ طلاقیں تو بے شمار ہوں گی اور بات بات پر ہوں گی لیکن لوگ طلاق اور نکاح کے فرق کے احسان سے عاری ہو جائیں گے۔

ہمارے نزدیک اس معاملہ میں صحیح راہ یہی ہے کہ مسلک جمہور کے خلاف کوئی قانون بنانے کی حماقت نہ کی جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس طرح طلاق دینے والے کے لیے قانون میں کوئی سزا بھی مقرر کی جائے تاکہ کتاب اللہ کے ساتھ اسٹنڈرڈ کا دروازہ بند ہو جس کو طلاق دینا ہو وہ صحیح طریقہ پر طلاق دے تاکہ کتاب اللہ کی توہین سے بھی محفوظ رہے اور جلد بازی کے نتائج سے بھی۔ مصنف عبدالرزاق میں ایک روایت ہے کہ :-

”حضرت عمرؓ کے سامنے ایک شخص پیش کیا گیا جس نے اپنی بیوی کو نذر طلاق دی تھی حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ تم نے اپنی بیوی کو سچ بچ طلاق دی ہے ؟ اس نے کہا نہیں، میں نے تو مذاق کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس کی کورسے سے ٹھہری اور فرمایا کہ طلاق کے لیے تو ان میں سے صرف تین ہی کافی ہیں۔

اس کے علاوہ دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کے ہر فرقہ کو اپنے اپنے مسلک پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ بات دستور کے بالکل مطابق ہوگی۔ دستور میں یہ ضمانت دی گئی ہے کہ پرنسپل لاکے معاملات میں ہر فرقہ کے لیے کتاب و سنت کی دی تفسیریں معتبر ہوں گی جو اس فرقہ کے لوگ پیش کریں گے۔ جہاں میاں بیوی دونوں ایک ہی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ وہاں تو کسی زحمت کا سوال نہیں ہے۔ البتہ جہاں اختلاف ہو وہاں شور مہر کا مسلک اہل قرار پائے۔

طلاق کی رجسٹری کمیشن نے نکاح کی طرح طلاق کے لیے بھی رجسٹری کی سفارش کی ہے اور اس کے دو طریقے تجویز کیے ہیں۔ ایک تو وہی ہے جو نکاح کی رجسٹری کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ معیاری نکاح نامہ کی طرح ایک معیاری طلاق نامہ ہو۔ اس کے فارم ہر ڈاکٹرنے سے آٹھ آنے میں مل سکیں۔ اس میں طلاق کی نوعیت کی پوری تفصیل درج ہو کہ کس شکل میں دی گئی ہے، ایک مجلس میں یا تین الگ الگ گھروں میں، اس کی ایک کاپی مطلقہ کے پاس رہے، دوسری طلاق دینے والے کے پاس اور تیسری کاپی کو طلاق دینے والا تحصیلدار کے پاس رجسٹری کر کے بھیج دے۔ اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرے تو اس کو پانچ سو روپے تک جرمانہ کی سزا ہو۔

لیکن کمیشن کو اس شکل پر پورا اطمینان نہیں ہے کہ یہ عورت کے حقوق کے تحفظ کے لیے کافی ہے، اس کا تاثر یہ ہے کہ مرد سب اوقات ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے کر بیوی اور اس کے بچوں کو گھر سے باہر نکال پھینکتا ہے اور دوسری بیوی گھر میں لایا جاتا ہے۔ ان مظلوموں کے پاس نہ پیٹ پالنے کا کوئی ذریعہ ہوتا نہ آسمان کی چھت کے سوا ان کے سروں پر کوئی چھت ہوتی۔ اس وجہ سے کمیشن نے دوسری قابل اطمینان تجویز یہ پیش کی ہے کہ طلاق کا ہر معاملہ شادی بیاہ کی مجوزہ عدالتوں میں پیش ہو اور عدالت اس وقت تک کسی شخص کو طلاق کی اجازت نہ دے جب تک وہ یہ اطمینان نہ کر لے کہ مطلقہ کا پورا جہاد کر دیا گیا ہے اور اس کی اور اس کے بچوں کی کفالت کا قابل اطمینان انتظام کر دیا گیا ہے اگر مہر کی ادائیگی بالاقساط ہوتی ہے تو اس کی اقساط بھی عدالت کی طرف سے معین ہو جانی چاہئیں۔

اس کی پہلی شکل پر مجھے وہی اعتراض ہے جو میں نکاح کی رجسٹری کے سلسلہ میں

پیش کر چکا ہوں۔ اگر رجسٹری کی یہ سادہ شکل اختیار کی گئی تو تحصیلدار کا رجسٹر جھوٹی سچی اور فرضی رپورٹوں کی ایک کھتونی سے زیادہ وقعت نہیں رکھے گا اور جن جھگڑوں سے بچنے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی جا رہی ہے ان میں کمی ہونے کے بجائے اس کے سبب سے اور بھی زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے اثرات کی صحیح تصویر ذہن کے سامنے لانے کے لیے میری مذکورہ بحث پھر پڑھ لیجیے۔

دوسری صورت تو اس پر مجھے مختلف پہلوؤں سے اعتراضات ہیں اور یہاں میں ان کی طرف بعض اشارات کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ کمیشن نے طلاق کے معاملات میں مرد کو بہر صورت ایک مجرم مان لیا ہے کہ وہ بس یونہی طلاق دے ڈالتا ہے، بیوی بچوں کو شرک پر لے بہا، چھوڑ دیتا ہے، نئی بیوی گھر میں لا لیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ صورت حال بالکل ایک طرف جائزہ ہے۔ طلاق کے سو واقعات میں سے دو چار واقعات اس نوعیت کے بھی ہوتے ہیں، لیکن اگر کہا جائے کہ سارے واقعات یا اکثر واقعات اسی نوعیت کے ہوتے ہیں تو یہ ایک نہایت غلط اندازہ ہے جو محض صوفیوں پر بیچ کر لگا لیا گیا ہے۔ مرد عموماً طلاق کے معاملہ میں اتنا بے احتیاط اور ظالم نہیں ہوتا جتنا ارکان کمیشن نے اس کو فرض کر لیا ہے، بلکہ لمبا اوقات وہ بیوی کی بدزبانی، اس کی بد اخلاقی اور اس کی جھگڑا و طبعیت سے تنگ آکر اور بالکل بے بس و مجبور ہو کر طلاق دیتا ہے۔ کم از کم غربا اور غریب کے طبقہ میں زیادہ تر طلاقیں ایسی قسم کی ہوتی ہیں۔ ان کو نئی بیوی لانے کا شوق اتنا نہیں ہوتا جتنا فرض کر لیا گیا ہے۔ اسی صورت میں مہر کا معاملہ تو خیر ایک شرعی ذمہ داری ہے، اور بچوں کی کفالت بھی قابل لحاظ چیز ہے، لیکن عدالت کو

یہ کس شرع کی رو سے حق ہے کہ وہ مرد سے مطلقہ کی کفالت کی ضمانت طلب کرے؟ مطلقہ کی کفالت تو مرد کے ذمہ زمانہ عدت میں ہے، اور اگر وہ حاملہ ہے تو وضع حمل تک اور اگر وہ اس کے بچے کو دودھ پلائے تو زمانہ رضاعت میں۔ ان زمانوں کے سوا مرد پر مطلقہ کی کفالت کی ذمہ داری نہ شریعت نے ڈالی ہے اور نہ عقل اس کو جائز رکھتی ہے۔

یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ طلاقیں بالعموم غربا کے طبقہ میں ہوتی ہیں اور عام طور پر ان کے اسباب معاشی ہوتے ہیں۔ بیوی کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں جس کے سبب سے میاں بیوی میں تو تو میں میں ہوتی رہتی ہے اور پھر نوبت طلاق تک جا پہنچتی ہے۔ اب اگر ایک شخص معاشی اعتبار سے مجبور ہے اور اس مجبوری ہی نے طلاق تک نوبت پہنچائی ہے تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس سے مہر اور بچوں کی کفالت کے ساتھ ساتھ مطلقہ کی کفالت کی بھی ضمانت مانگی جائے۔ اگر وہ یہ ضمانت دے سکنا تو بیوی کو طلاق ہی کیوں دیتا؟ اب فرض کیجیے کہ یہ ضمانت نہ دے سکے کی وجہ سے عدالت اس کو طلاق دینے کی اجازت ہی نہیں دیتی تو اس سے زیادہ نامعقول حرکت اور کیا ہوگی؟ کیا عدالت کی اس مداخلت کی وجہ سے ان کی معاشی مشکل حل ہو جائے گی اور وہ لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیں گے اور ان کے تعلقات خوشگوار ہو جائیں گے؟ ہر شخص ان سوالوں کا یہی جواب دے گا کہ نہیں۔ بلکہ ہوگا یہ کہ مرد پہلے سے بھی زیادہ اپنی اس بیوی کو اپنے لیے عذاب جان سمجھے گا اور عورت بھی اپنی قسمت پر ماتم کرے گی کہ نہ رہائی ملتی ہے نہ روٹی۔ پھر عدالت کی اس مداخلت سے کیا فائدہ حاصل کرنا پیش نظر ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ شریعت نے طلاق کا حق مرد کو دیا ہے، آپ کس فائدے

سے یہ حق مرد سے چھین کر عدالت کے حوالہ کر رہے ہیں۔ کیا اس پر کوئی شرعی یا عقلی دلیل ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ یہ حق مرد سے چھین کر عدالت کے حوالہ اس لیے کیا جا رہا ہے کہ عدالت اس حق کو مرد کی نسبت زیادہ احتیاط کے ساتھ استعمال کرے گی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورت کو بیوی بنا کر رکھنا عدالت کو ہے یا مرد کو؟ اگر مرد ہی کو ہے اور وہ بیوی سے بیزار ہے، اگر کہہ سنانے کے لیے تیار نہیں، تو عدالت اس معاملہ میں مداخلت کر کے کیا بنائے گی؟ وہ زیادہ سے زیادہ یہی تو کر سکتی ہے کہ مرد کو طلاق دینے کی اجازت نہ دے لیکن اس اجازت نہ دینے سے اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ مرد کی بیزاری عورت سے اور زیادہ بڑھ جائے گی اور عورت کی زندگی اس گھر میں اجیرن ہو کے رہے گی۔ عدالت کا کام کسی جھگڑے کا فیصلہ کر دینا ہے تو شوگر اور گھر میں زندگی پیدا کرنا اور بیوی کو محبت کرنے والا شوہر دلوانا عدالت کے اسکان میں نہیں ہے۔ رہا مہر وغیرہ کی ادائیگی کا معاملہ تو اس کو جھگڑا بننے سے پہلے ایک جھگڑے کی حیثیت سے دنیا کہاں کی دانشمندی ہے۔ طلاق کے واقعات میں سے کچھ ہی واقعات ایسے ہوتے ہیں جن میں مہر کا معاملہ نزاعی صورت اختیار کرتا ہے۔ ان کے طے کرنے کے لیے اگر کمیشن کی مجوزہ شادی بیاہ کی عدالتیں موجود ہوں تو عورت کے ساتھ کسی نا انصافی کا اندیشہ نہیں ہے۔ پھر بغیر کسی نزاع کے پیدا ہوئے آخر ہر واقعہ طلاق کو ایک مقدمہ کیوں بنا لیا جائے اور اس کو عدالتوں میں کیوں زیر بحث لایا جائے؟

تیسری بات یہ ہے کہ شوہر کی طرف سے طلاق کی خواہش بہت سے ایسے اسباب کی بنا پر ہوتی ہے جن کو وہ خود ہی محسوس کرتا ہے، دوسروں کو محسوس نہیں کر سکتا۔ وہ جب محسوس کرتا ہے کہ بیوی سے کسی طرح نباہ نہیں ہو سکتا تو بالآخر طلاق دینے پر آمادہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایک عدالت یہ فیصلہ کرنے کی بجائے طلاق کے وجوہ معقول ہیں یا نہیں تو شوہر کو

کو مجبوراً اپنی بیزاری کے اصل اسباب چھپا کر بیویوں پر ایسے الزامات لگانے پڑیں گے جنہیں کوئی عدالت معقول وجہ طلاق مان سکے۔ اور یہ الزامات بیشتر اخلاقی نوعیت کے ہوں گے جیسا کہ آج کل یورپ میں مشاہدہ ہو رہا ہے۔ یورپ میں تو ممکن ہے کہ ایک عورت ایسے الزامات لگنے کے باوجود باعزت رہ سکے لیکن ہمارے ملک میں جس عورت کو ان الزامات کی بنا پر عدالت سے طلاق ملے گی اس کی زندگی ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائے گی اور ان مقدمات کے چرچے جب عدالتوں سے باہر ملک میں پھیلیں گے تو معاشرے کی رہی سہی اخلاقی حالت بھی برباد ہو کر رہے گی۔

مولانا احتشام الحق صاحب کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ اگر معاہدہ نکاح میں مرد یہ شرط تسلیم کر لے کہ میں اگر منکوحہ کو طلاق دوں گا تو شادی بیاہ کی عدالت ہی کے ذریعے سے دوں گا تو مرد کا یہ حق عدالت کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ چونکہ مولانا احتشام الحق صاحب کی اپنی بات ہمارے سامنے نہیں ہے اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے کیا کہا ہوگا اور کمیشن نے اپنے مطلب کے لیے اس کو کس طرح استعمال کیا۔ نکاح کے شرائط اور تفویض و توکیل وغیرہ پر میں پچھلے صفحات پر عورت کے حق طلاق کی بحث کے ضمن میں گفتگو کر چکا ہوں۔ ان تمام مباحث کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ معاہدہ نکاح میں اس شرط کو ہر مرد کے لیے از روئے قانون تسلیم کرنا ضروری ہوگا یا اختیاری؟ اگر اختیاری ہوگا تو ہمارے اندر کتنے مرد ایسے نکلیں گے جو یہ شرط تسلیم کرنے پر راضی ہوں گے؟ اور اگر لازمی ہوگا تو یہ صریح اکراہ ہے جس کی مشروعیت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نہ شرائط نکاح میں کوئی چیز ناجائز ہونی چاہتی ہے اور نہ وہ تفویض یا توکیل از روئے شرع جائز ہے جس میں ہجو و اکراہ کا شائبہ ہو۔

اصل یہ ہے کہ نکاح اور طلاق کے معاملات میں عدالتوں کی مداخلت ان کی فطرت کے بالکل منافی ہے۔ ان کی بنیاد میاں بیوی کے تعلقات کی خوشگوار اور ناخوشگوار پر ہے۔ عدالتیں فصل مقدمات کا ایک ذریعہ تو بن سکتی ہیں لیکن میاں بیوی میں باہمی اعتماد اور سنجوگ پیدا کرنا ان کا کام نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے میاں اور بیوی کے معاملات میں عدالتوں کی مداخلت زیادہ پسند نہیں کی ہے۔ اگر حقوق کا کوئی جھگڑا پیدا ہو گیا ہے تو عدالت اس کا فیصلہ کر دے، اگر مرد کی طرف سے کوئی تعدی ہو رہی ہو تو عدالت اس کو روک دے۔ اگر عورت مرد سے چھٹکارا چاہتی ہے اور عدالت مطمئن ہو کہ اس مرد سے اس کا نیاہ نہیں ہو سکتا تو وہ اس کے نکاح کو فسخ کر دے۔ یہ کام عدالت کے کرنے کے ہیں۔ لیکن اگر میاں بیوی کے مابین ہی معاملات عدالتوں کے ذریعے سے طے پانے لگے تو پھر میاں بیوی کا تعلق بس ضابطہ کا ایک سرکاری تعلق بن کے رہ جائے گا اور حبس و ہتس تبدیل ہو جائیں گی تو جہاں سے کسی نزاع کے بھی پیدا ہونے کا امکان نہ ہوگا وہاں سے بھی کوئی نہ کوئی نزاع اٹھ کھڑی ہوگی۔

مطلقہ کی کفالت کمیشن نے سفارش کی ہے کہ شادی بیاہ کی عدالتوں کو اختیار ہونا چاہیے کہ جن عورتوں کو بائیس سبب معقول کے ادھیڑ میں طلاق سے دی جاتی ہے ان کی کفالت کا بارنا عقد ثانی یا مدت العمر کے لیے مشورہ پر ڈال دیں۔

اس سفارش کی تائید میں کوئی اس طرح کی ٹنگڑی بولی دلیل بھی دینے کی کوشش نہیں کی گئی ہے جس طرح کی دلیلیں دینے کا کمیشن عادی ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس نے مرد پر مطلقہ کی کفالت کی ذمہ داری یا تو زمانہ عدت میں ڈالی ہے یا زمانہ سحلی میں یا زمانہ رضاعت میں۔ ان صورتوں کے سوا کسی اور صورت میں مطلقہ کی کفالت کی کوئی ذمہ داری مرد پر نہیں ہے اور یہی عقل اور انصاف کا بھی تقاضا معلوم ہونا ہے غالباً یہ سفارش سمجھ دہی سوال کے جذبہ کے

تحت کی گئی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو اپنی جگہ پر یہ ایک اچھی بات ہے لیکن اس سمجھ دہی کا بوجھ حکومت کو اٹھانا چاہیے نہ کہ غریب طلاق دینے والے کو جس نے نہ معلوم کن مجبوریوں کے تحت طلاق دی ہے۔

یہ سفارش اگر قانون کی شکل اختیار کر لے تو اس سے عورتوں ہی کو مختلف پہلوؤں سے نقصان پہنچے گا۔ برصورت کے دوجہ طلاق عدالتوں میں زیر بحث آئیں گے اور مردوں کو کفالت کے بارے میں چھٹکارا پانے کے لیے اپنے دوجہ طلاق کو نہایت دزنی بنانا پڑے گا۔ یوں تو طلاق کے دوجہ کا زیر بحث آنا مرد یا عورت میں سے کسی کے لیے بھی مفید نہیں ہے لیکن کمزور خرق ہونے کی وجہ سے عورت کے لیے یہ چیز نہایت مضر ہے۔ ہمارے معاشرہ کا حال یہ ہے کہ طلاق بجا ہے خود ایک ایسی چیز ہے جو عورت کی حیثیت کو خاص حد تک مجروح کر دیتی ہے اور اگر طلاق عدالت میں زیر بحث آکر باقاعدہ مستند بھی ہو جائے اور عدالت اس پر اپنی تصدیق بھی ثبت کر دے کہ نہایت معقول دوجہ کی بنا پر طلاق دی گئی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ عورت نہ گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔ چپ چپانے طلاق ہوئی تو اس بات کی بڑی گنجائش تھی کہ اگر ایک نے چھوڑا تھا تو کوئی دوسرا مرد اس سے نکاح کر لیا۔ لیکن عدالت کی ایک مذہباً مطلقہ کو آپ کے موجودہ معاشرہ میں اپنے حائل عقد میں لینے کی جرأت کون مرد کر سکے گا؟ بلکہ وہ کہاں عزت کی زندگی بسر کرنے کے قابل بھی رہ جائے گی؟ اور اس کا خاندان تک اسے آبروی سے کب بچا رہ جائے گا؟

معاشرہ پر بحیثیت مجموعی اس کا جواز نہ پڑے گا وہ بھی کچھ کم مضر نہیں ہے۔ اس سفارش کے قانون کی شکل اختیار کر لینے کے بعد ہمارے ہاں طلاق کا ہر واقعہ اپنے اندر نہ جانے کیا کیا حکایتیں اور افسانے لے کر نمودار ہوگا اور خدا ہی جانے کہ کس کس قسم کے گندے کپڑے ان شادی بیاہ کی عدالتوں کے گھاٹ پر دھلیں گے اور ان عدالتوں کی کارروائیاں جلی عنوانات سے

اختیارات میں چھپیں گی اور یہ اصلاح معاشرہ کے علمبردار حضرات مزے لے لے کر ان دستانوں کو پڑھیں گے۔

غور کیجیے کہ یہ عورت کے حقوق کی حفاظت ہوئی یا اس کو برسرِ باز دار سو اکر نے کی ایک نہایت ہی ظالمانہ تدبیر۔

تعدد ازدواج پر پابندیاں | تعدد ازدواج کے متعلق کمیشن کی سفارش یہ ہے کہ یہ قانون بنادیا جائے کہ ایک بیوی کے جوئے ہوئے کسی شخص کو شادی بیاہ کی عدالت سے اجازت حاصل کیے بغیر کسی اور عورت سے نکاح کرنے کا حق نہ ہوگا۔

عدالت یہ اجازت کسی شخص کو تین باتوں کا اطمینان کر لینے کے بعد دے گی :-

ایک یہ کہ دوسری شادی کے لیے کوئی عقلی جواز موجود ہے۔ مثلاً یہ کہ بیوی بالکل بے باخاںزہ عقل ہے، یا کسی مریض بیمار میں مبتلا ہے، یا ایسی قسم کا کوئی اور معقول سبب موجود ہے۔
مجرد یہ بات کہ دوسری عورت جوان اور خوبصورت ہے یا یہ کہ مرد اپنی پہلی بیوی پر قناعت نہیں کر سکتا کمیشن کے نزدیک کوئی معقول سبب نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ مرد کی مالی پوزیشن ایسی ہے کہ وہ بیک وقت دو کنبیوں کی کفالت کا بوجھ اٹھا سکتا ہے اور اس دوسری شادی سے اس کی سابق بیوی اور اس کے بچوں کے اس معیار زندگی میں کوئی فرق پڑنے کا اندیشہ نہیں ہے جس کے وہ عادی ہیں۔

تیسری یہ کہ اگر پہلی بیوی مرد کے دوسری شادی کر لینے کی صورت میں علیحدہ قیام کی طالب ہے تو مرد اس کے لیے کیا ضمانت دیتا ہے اس کے لیے عدالت یہ بھی کر سکتی ہے کہ مرد کی تنخواہ یا اس کی آمدنی کا ایک مناسب حصہ عورت کو براہِ راست ملا کر دے۔

کمیشن نے اپنی سفارشات کی تائید میں جو دلیل دی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن نے تعدد ازدواج

کی اجازت صرف ایک جگہ سورہ نسا میں دی ہے۔ اور یہ اجازت ایک ہنگامی ضرورت کے موقع پر یتیموں اور یتیموں کا مسئلہ حل کرنے کے لیے عدل کی نہایت کڑی شرط کے ساتھ دی گئی۔

اب تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانوں نے اس اجازت سے نہایت غلط فائدہ اٹھایا ہے جس کے سبب سے عورتوں کے حقوق تلف ہو رہے ہیں۔ اس وجہ سے حکومت کا جو معاشرتی عدل کی ذمہ دار ہے۔ یہ فرض ہے کہ وہ اس اجازت پر ایسی پابندیاں عائد کر دے جن سے موجود خرابیوں کی ممکن حد تک اصلاح ہو سکے۔ کمیشن نے اپنے اس نقطہ نظر کی تائید میں یہ بھی کہا ہے کہ بیماری پیدا ہو جانے کے بعد اس کے علاج کی فکر کرنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ بیماری کے سبب ہی کا خاتمہ کر دیا جائے۔

سورہ نسا کی آیت سے متعلق کمیشن کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ ایک ہنگامی ضرورت کے موقع پر مسلمانوں کو تعدد ازدواج کی اجازت دینے کے لیے نازل ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی اجازت تو پہلے ہی سے موجود تھی، چنانچہ اسی اجازت کے تحت خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں، اور صحابہ میں سے بھی بہت سے لوگوں نے ایک سے زیادہ نکاح کر رکھے تھے۔ اس آیت نے اجازت دی نہیں بلکہ سابق اجازت سے اس میں جتنی میں فائدہ اٹھانے کی مسلمانوں کو ہدایت کی جس سے اس وقت مسلمان دوچار تھے اور مزید برآں اس نے سابق اجازت پر چند پابندیاں بھی عائد کر دیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس آیت سے نزول کے سبب یہ نہیں ہوا کہ یتیموں اور یتیموں کی مصلحت کے تحت مسلمانوں نے ایک سے زیادہ نکاح کرنے شروع کیے ہوں بلکہ ہوا یہ کہ جن کے نکاح میں چار سے زیادہ عورتیں تھیں انہوں نے ان کو طلاق دے دی اور

جو لوگ عدل کا اہتمام نہیں کر رہے تھے وہ عدل کا اہتمام کرنے لگے۔

اس وجہ سے یہ گناہ تو بالکل ہی غلط ہے کہ اس آیت نے مسلمانوں کو محض یتیموں اور یتیموں کی مصلحت کے تحت ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت دی تھی۔ اگر کہیں جا سکتی ہے۔۔۔۔۔ تو یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں کو تعدد ازدواج کی جو اجازت پہلے سے حاصل تھی، اس آیت نے اس اجازت کو ایک خدمت اور اثبات کے لیے استعمال کرنے کی تلقین کی، وہ یہ کہ وہ اس کو یتیموں کی مصلحت کے لیے استعمال کریں اور حتی الامکان ان کی ماؤں سے نکاح کریں تاکہ یتیموں کا مسئلہ بھی حل ہو اور یتیموں کی اعداد اور پرورش کی بھی ایک صورت پیدا ہو۔ اسلام نے تعدد ازدواج کی اجازت صرف یتیموں ہی کی مصلحت کے تحت نہیں دی ہے بلکہ بہت ہی مصلحتوں کے تحت دی ہے جن میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے:-

۱۔ بعض اوقات دین کے مصالح کا تقاضا ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک سے زیادہ شادیاں کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد نکاح کیے اور ان میں سے کسی ایک نکاح ہی بھی تباہی کی مصلحت کا کوئی سوال نہیں تھا۔ البتہ بحیثیت مجموعی دین کی مصلحت آپ کے تعدد ازدواج میں نمایاں نظر آتی ہے۔ سورہ احزاب میں حضور کی ازدواج کو جو نصیحتیں اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوتِ دین کی جو ذمہ داری آپ پر ڈالی گئی تھی اس میں آپ کی ازدواج مطہرات بھی شریک تھیں۔ ان کو یہ مہارت ملی ہوئی تھی کہ تمہارے گھروں میں اللہ کی جو باتیں اور حکمت کی جو باتیں پڑھی جاتی ہیں ان کا چرچا کرو۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے

کہ خواتین کے طبقہ میں شریعت کی باتیں زیادہ تراجمات المؤمنین ہی کے ذریعہ سے پہنچیں عموماً وہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خواتین کے درمیان واسطہ بنتی تھیں اور آپ کے دین کو سیکھ کر امت کی بہنوں، بیٹیوں کو سکھاتی تھیں۔ اس سلسلہ میں ازدواج مطہرات کا سب سے بڑا اثبات جس کے بار مومنیت سے کسی شخص کی بھی گردن نہیں اٹھ سکتی یہ ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی حصہ بھی پرائیویٹ نہیں رہ گیا۔ جو باتیں میاں اور بیوی کے درمیان ماز ہوا کرتی ہیں اور کسی کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان کی ٹوہ لگائے، اور نہ کوئی از خود ان کو ظاہر کرنا پسند کرتا ہے، ازدواج مطہرات کی وہ باتیں بھی امت کی تعلیم کے لیے لوگوں کے سامنے آئیں، اور یہ انہی چیزوں کی برکت ہے کہ بھاری پرائیویٹ زندگی کے نہاں خانوں میں بھی تزکیہ کی روشنی داخل ہوئی۔ خصوصیت کے ساتھ اس تعلیم و تزکیہ میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ کا جو حصہ ہے اس کی شکر گزاری کے حق سے نہ تو غور نہیں کبھی سیکھ دیش ہو سکتیں اور نہ مرد۔ ۲۔ بعض اوقات قومی اور سماجی مصالح کا تقاضا ہوتا ہے کہ مرد ایک سے زیادہ شادیاں کریں۔ اس کی بہترین مثال خود سورہ نسا کی مذکورہ آیت ہی میں ہے۔ جب جنگ کے سبب یتیموں اور یتیموں کا مسئلہ مسلمانوں کے سامنے آیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ ان کو معاشرہ میں باعزت جگہ دلانے کے لیے تعدد ازدواج کی موجودہ اجازت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ آج بعینہ یہی مسئلہ انگلستان اور یورپ کے بہت سے ملکوں میں پھیلی ہوئی جنگوں کے سبب پیدا ہو گیا ہے اور اس نے ان کے پورے سماجی نظام کو تہہ و بالا کر دیا ہے، لیکن وہاں کے لال بچکڑ لوگ ساری ذلالتیں جھیل رہے ہیں، گلی گلی عورتیں ماری ماری پھر رہی ہیں لیکن ملک و جنگی کا قانون ان کے پاؤں میں ایک ایسی زنجیر کے رہ گیا ہے کہ اس کی اصلاح کے لیے کوئی قدم اٹھانا ان کے لیے ناممکن ہے۔ آج انگلستان وغیرہ میں اس قانون کے

سبب سے عورتوں کا جو حال ہے اس کا اندازہ ایک نامہ نگار کے مندرجہ ذیل بیان سے کیجئے۔

”۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۵ء کی عالمگیر جنگوں نے انگلستان میں عورتوں کا مناسب مردوں سے زیادہ کر دیا ہے۔ چنانچہ یہاں اکثر عورتیں شادی کا ارمان دلی ہیں یہ بے ہوشی بڑھی ہو جاتی ہیں۔ یوں تو وہ زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن زندگی کا حقیقی سکون انھیں میسر نہیں آتا۔ لندن کے ایک پادری صاحب کہتے ہیں کہ آج کل اگر غلطی سے کسی دوستیہ کو شادی شدہ سمجھ لیا جائے تو وہ چند لمحوں کے لیے باغ باغ ہو جاتی ہے۔“

”اکثر کنواری لڑکیوں نے زندگی کا مقصد ہی شادی سمجھ رکھا ہے وہ شادی کے لیے ماری ماری پھرتی ہیں اور انھیں جو لڑکا بھی مل جاتا ہے اسے اپنا ممکنہ شرمگینا شروع کر دیتی ہیں۔“

پادری صاحب مزید فرماتے ہیں :-

”جو دوستیہ اس منہر کھلا سکتی ہیں وہ اپنے آپ کو اعلیٰ دارفہ سمجھنا شروع کر دیتی ہیں اور احساس برتری کے مرض کا شکار ہو جاتی ہیں۔ وہ ان سہیلیوں کو ذرا نفرت سے دیکھنا شروع کر دیتی ہیں جن کو شرم نہیں ملتے۔ عام لڑکیاں جب ایک دوسری سے ملتی ہیں تو سب سے پہلے ان کی نگاہیں دوسری کی انگلی میں شادی کی انگلی کی تلاش کرتی ہیں۔ ان حالات میں لڑکیاں شادی کے خیال ہی سے محبت شروع کر دیتی ہیں۔“

پادری صاحب نے گھلے لیا ہے کہ لڑکی جو پہلی پندرہ کے سن میں پہنچتی ہے اسے شادی کا خیال تانا شروع کر دیتا ہے۔ دراصل یہ تکایت فضول ہے۔ انگلستان اور یورپ میں مردوں کی

کمی ایک مسئلہ بن چکی ہے اور مغربی تہذیب میں بے راہ رومی کے جو گھٹاؤنے مظاہرے نظر آتے ہیں اس کی وجہ یہی مردوں کی کمی ہے۔ عورت کی شادی کی خواہش ایک قدرتی خواہش ہے لیکن مغربی داناؤں نے اس کا علاج یہ نکالا ہے کہ مرد شادی تو ایک ہی کرے لیکن عیاشی جتنی عورتوں سے چاہے کرے۔ مغربی تہذیب، مذہب اور قانون یہ تو برداشت کر لیتے ہیں کہ شادی شدہ مرد اشتہار رکھ لے لیکن دوسری شادی ان کے نزدیک معیوب اور خلاف تہذیب ہے۔

لندن میں تمام ملک سے لڑکیوں کے کچھ کچھ جمع ہونے کے اسباب اور وہاں ان کے مشاغل کی تفصیل نامہ نگاریوں میں بیان کرتا ہے :-

”گھر میں ماں بوائے خریدنے سے ملنے پر اعتراض کرتی تھیں، یہاں ترقی کے مواقع زیادہ ہیں۔ سنگین سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ ایک دس بنے کا شوق بھی صاحبزادیوں کو چراتا ہے اور کچھ دنیا دیکھنے گھر سے نکل کھڑی ہوتی ہیں اور پھر یہاں پرسنیکروں ٹائٹوں والے لائینرز اور اسے بی سی کے سستے کھانے والے ریسٹوران ہیں جہاں ہزاروں لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ دل درتھ۔ اڈا اسپنسر انڈیا مارکس کے وسیع و عریض اسٹوروں میں شاپ گرل بن سکتی ہیں۔ ہوٹلوں میں ڈیسٹرس بن سکتی ہیں۔ سکرٹری بن سکتی ہیں اور فوٹو گرافوں کے ماڈل اور ہندوستانی اور پاکستانی تہنہزادوں کے حرم کی زینت۔ ان میں سے اکثر چار پانچ پونڈ سے لے کر سات اکھ پونڈ فی ہفتہ تک کماتی ہیں جس سے مشکل اپنا ضروری خرچ چلاتی ہیں اور جنھیں کچھ بچا کر اپنے بوڑھے ماں باپ کو بھی بھیجتا ہوتا ہے۔ وہ زندہ رہنے کے لیے پوری غذا بھی نہیں کھا سکتیں اور تقریباً تمام ہی شام کو

تفریح کے لیے "شکار" کی تلاش میں رہتی ہیں، جو انہیں پکچر دکھا دے، رستوں میں ایک وقت کا کھانا کھلا دے، یا کسی اچھے کافی ہاؤس میں کافی کی ایک پیالی ہی ملا دے اور انہیں اس "آزادی" اور دنیا دیکھنے کی حقیت ادا کرنی پڑتی ہے؟

"یہاں عورت آزاد ہے لیکن اس کی حالت قابلِ رحم ہے۔ یہاں عام عورت کی کوئی عزت نہیں۔ کوئی مقام نہیں۔ اگر وہ مشرق کی مظلوم عورت کی "جیل" کی زندگی کی ایک تھلک دیکھ لے تو آزادی اور مساوات سے فوراً توبہ کر لے۔ یہاں ہزاروں عورتیں ساری عمر گھر اور اولاد کو ترستے ہوئے زندگی بسر کر رہی ہیں اور انہیں اپنی مظلومی اور کس میری کا پورا احساس ہوتا ہے۔"

یہ ہے انگلستان اور یورپ کے اکثر ملکوں کے معاشرہ کا حال۔ قوم کی قوم آبرو باختہ بن کر رہ گئی ہے۔ عفت اور پاکدامنی کا تصور بھی ذہنوں سے غائب ہو چکا ہے۔ مرد عورت کے تعاقب سے پیچھے آٹھے ہیں اور عورت نے مرد کی جستجو میں شرم و حیا کے سارے پرے اٹھا دیئے ہیں۔ یہ سب کچھ صاحب لوگوں کو گوارا ہے لیکن اگر ہمیں گوارا ہے تو تعداد ازدواج جو اس مشکل کا واحد حل ہے۔

بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ اگر کسی آفت کے سبب عورتوں کی تعداد زیادہ ہو جانے کی صورت میں تم مردوں کو یہ اجازت دیتے ہو کہ وہ ایک سے زیادہ شادیاں کریں تو یہی اجازت ہمیں عورتوں کو اس صورت میں دینی چاہیے جب کسی آفت ارضی و سماوی کے سبب سے کسی ملک میں عورتوں کی تعداد کم رہ جائے اور مرد زیادہ ہو جائیں۔ یہ اعتراض ہمارے نزدیک بالکل بے حقیقت ہے۔ جہاں تک قدرت کا تعلق ہے وہ اس معاملہ میں کبھی ایسا عدم توازن

پیدا نہیں ہونے دیتی جس کا علاج خود اس کسر و انکسار سے نہ ہوتا رہے جو اس کے اپنے نظام میں واقع ہونا رہتا ہے۔ وہ عورتوں اور مردوں کو پیدا بھی ایک خاص تناسب کے ساتھ کرتی ہے اور اس کی طرف سے جو بیماریاں اور آفتیں آتی ہیں وہ مارتی بھی عورتوں اور مردوں کو ایک خاص تناسب ہی کے ساتھ ہیں۔ وہ نہ تو پیدا کرنے میں کبھی یہ شکل اختیار کرتی ہے کہ کسی قوم میں عورتیں ہی عورتیں پیدا ہو جائیں، مرد پیدا ہی نہ ہوں، یا ان کی کم تعداد میں پیدا ہوں کہ قوم کے لیے ان کی کمی ایک مسئلہ بن جائے اور نہ اس نے مارنے میں کبھی یہ صورت اختیار کی ہے کہ جن جن کے مردوں کو مار دے اور عورتیں بچی رہ جائیں۔ یہ صورت تو تاریخ میں جب بھی پیدا ہوئی ہے کسی جنگ ہی کے سبب سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ کے لیے فطری طور پر مرد ہی موزوں ہیں اور اسی کو یہ کام کرنا بھی پڑتا ہے۔ عورت کے لیے یہ کام نہ تو موزوں ہی ہے اور نہ کبھی مردوں کی غیرت نے یہ گوارا ہی کیا ہے کہ وہ جنگ اور دفاع کی ذمہ داریاں عورت پر ڈال دیں۔ اسلام ایک دینِ فطرت ہے اس وجہ سے اس نے نہ تو یہ پسند کیا ہے کہ عورتیں جنگ کے لیے نکلیں اور نہ یہ اجازت دی ہے کہ دشمن قوم کے بچوں اور ان کی عورتوں کو قتل کیا جائے۔ اسلام کے قانونِ جنگ میں عورت غیر مصافی آبادی سے تعلق رکھتی ہے اس وجہ سے ایک اسلامی حکومت میں جنگ کے سبب سے عورتوں کی تعداد کے کم ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ البتہ جن قوموں نے آج عورت کو بھی محاذِ جنگ پر لاکھڑا کیا ہے ان کے ہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے لیکن وہ بھی اس صورت میں جب مرد گھروں میں گھس کر بیٹھ رہیں اور جنگ کا کام صرف عورتیں ہی سنبھالنے پر مجبور کر دی جائیں اگلی چیز کی وجہ سے یہ سوال کسی قوم کے اندر پیدا ہوا تو اس کے حل کرنے کی ذمہ داری خود اسی پر ہے نہ کہ اسلام پر جو اس صورتِ حال ہی کو سرے سے خلافِ فطرت قرار دیتا ہے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر انگلستان اور یورپ کے ممالک میں مردوں کی کمی اور عورتوں کی زیادتی کے سبب ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے کہ تعدد ازدواج کے بغیر وہاں کا معاشرتی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تو وہاں اس کی اجازت ہونی چاہیے لیکن ہمارے معاشرہ میں جہاں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابل میں کچھ کم ہی ہے یہ اجازت کیوں دی جائے؟ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ اگر ہمارے ہاں عورتوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے تو یہاں تعدد ازدواج کا رواج کہاں زیادہ ہے؟ خود کمیشن نے جو اس بیماری کا اعداد کرنے کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں۔ اپنی اپنی رپورٹ میں صاف الفاظ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہمارے معاشرہ میں تعدد ازدواج کا رواج بہت کم ہے۔ اگر کم ہے اور یقیناً کم ہے تو آخر اس شد و مد سے اس کے خلاف حملاً قائم کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی ہے؟ اگر آپ کہتے ہیں کہ اس کا رواج کم بھی لیکن اس کے سبب معاشرہ میں بعض نا انصافیاں پائی جاتی ہیں، تو کوشش ان نا انصافیوں کو دور کرنے کی کیجیے نہ کہ چند بے انصافیوں کو دور کرنے کے لیے ہزاروں فتنوں کے دروازے کھول دیجیے۔ یہ نا انصافیاں تو جیسا کہ ہم آگے چل کر واضح کریں گے اس اجازت کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ تمام تر ہمارے موجودہ نظام اور موجودہ معاشرہ کی غفلتوں کا نتیجہ ہیں۔ پھر اپنی حماقتوں کی اصلاح کرنے کے بجائے یہ اسلام کی اصلاح کی کوشش کیوں کی جا رہی ہے؟

۳۔ بعض اوقات ایک شخص محض اپنے گھر کے نظم کو ٹھیک رکھنے اور اپنے آپ کو یا کسی عقیقہ کو تہمتوں اور بدگمانیوں سے بچانے کے لیے مجبور ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرے فرض کیجئے ایک شخص کے گھر میں ایک بیوہ ہے، اس کے بچے ہیں جن کا دل بھی یہی شخص ہے، عورت اپنے بچوں کے خیال سے یا کسی دوسرے سبب یہ پسند نہیں کرتی کہ کسی اور خاندان میں نکاح کرے اور یہاں نکاح کے بغیر رہنے میں اندیشہ ہے کہ وہ کہیں کسی فتنہ میں پڑ جائے

یا بچا بدگمانیوں کا ہدف بنے، ان مختلف اسباب کے یہ شخص اس عورت سے نکاح کر لیتا ہے۔ اسلام میں یہ بات نہایت پسندیدہ اور اخلاق اور مروت دونوں اعتبار سے نہایت اعلیٰ ہے۔ لیکن کمیشن کے نزدیک یہ ایک جرم ہے۔

۴۔ بعض اوقات ایک شخص اپنے اخلاق تحفظ کے لیے مجبور ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرے۔ فرض کیجئے ایک شخص ہے، اس کی بیوی کمزور صحت کی ہے، وہ زیادہ اولاد کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ یہاں بیوی بڑھ کر لڑکھو لڑکھو کی طرح جانا چاہتی ہے، شوہر آوارگی، اور بد چلنی پر بھی راضی نہیں ہے۔ یا فرض کیجئے ایک شخص ہے، اس کا دل کسی عورت پر آ گیا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ اگر اس کے ساتھ اس نے نکاح نہ کر لیا تو وہ کسی فتنہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ یا وہ اپنے اندر مفرط جنسی جذبہ رکھتا ہے لیکن اسلام کے اخلاقی حدود کا سختی کے ساتھ پابند ہے۔ ایسی صورتوں میں مغربی سوسائٹی تو مرد کو فحشہ حازر، ٹائٹ کپڑوں اور عیاشی کے دوسرے اڈوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور جو عورت بھی اس سے اختلاط پر راضی ہو جائے اس سے آزادانہ تمتع کی اجازت دیتی ہے، لیکن اسلام اس کو ان ساری حرکتوں پر سخت سے سخت دنیوی سزا کی دھمکی اور آخری عذاب کی وعید سناتا ہے۔ البتہ اس بات کی اجازت دنیا ہے کہ وہ عدل کی شرط پوری کر سکتا ہو تو ایک سے زیادہ شادیاں کرے۔

اس پر بعض لوگ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ اگر کسی مرد کے مفرط جنسی جذبہ کی رعایت میں اس کو ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت دی جا سکتی ہے تو یہی جذبہ اگر عورت کے اندر مفرط حد تک ہو تو اسے بھی ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت ہونی چاہیے۔ یہ اعتراض جن لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے وہ علم الحیات کے مبادی تک سے ناواقف ہیں۔ ایک مرد اگر ہزار عورتوں کے پاس بھی جائے تو وہ ان سب کو حاملہ کر سکتا ہے لیکن ایک عورت خواہ کتنے ہی مردوں

پاس چلی جائے، بہر حال وہ حاملہ ایک ہی مرد سے ہوگی۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ ایک مرد کی کئی بیویاں ہونا تو فطرت کے مطابق ہے مگر ایک عورت کے کئی شوہر ہونا مطابق فطرت نہیں ہے۔ علاوہ بری ایک مرد کے کئی عورتوں کے پاس جانے کی صورت میں یہ بات یقینی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اولاد ہی کی ہے لیکن ایک عورت اگر کئی مردوں کے پاس جائے تو یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ اولاد ان میں سے کس کی ہے۔ اس طرح کثرت زوجات سے تو خاندانی زندگی کا نظام دیم بریم نہیں ہوتا مگر کثرت ازدواج سے وہ دیم بریم ہو جاتا ہے۔ اسلام چونکہ کسی بوالفضل آدمی کے دماغی بحران کا قیجہ نہیں ہے بلکہ فاطر کائنات کا مقرر کیا ہوا دین فطرت ہے اس لیے وہ ان فطری حقائق کی بنا پر مرد کے مفروضہ جنسی جذبہ کے لیے نو دو یا دو سے زائد شادیوں کی اجازت دنیا ہے لیکن اگر کسی عورت میں طبعاً یہ خواہش اعتدال سے زیادہ ہو تو اسے صبر کی تلقین کرتا ہے، باوجود اسے حد یہ کہ وہ ایک سے خلع لے کر دوسرے سے نکاح کرے۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے جو عورت حاملہ ہوتی ہے، بچے جنمی ہے، دودھ پلاتی ہے، گھر گریستی کی ذمہ داریوں میں مشغول رہتی ہے اور اپنا فاضل وقت کسی اچھے کام میں صرف کرتی ہے اس پر شاید یہ بھی اتنا اضطراب طاری ہوتا ہو کہ وہ حدود توڑنے پر آمادہ ہو جائے، اور ایک اسلامی معاشرہ میں ایک پسندیدہ عورت کے یہی اوصاف ہیں۔ رہی وہ عورت جو نہ حاملہ ہوتی ہے، نہ بچے جنمی ہے، نہ دودھ پلاتی ہے اور نہ اس کے ذمہ گھر گریستی کی کوئی ذمہ داری ہے۔ بلکہ بناؤ سنگار کر کے وہ صرف سیر سپاٹے میں مشغول رہتی ہے، مردوں سے آزادانہ اختلاط رکھتی ہے۔ رقص خانوں، کلبوں، سینماؤں اور مخلوط مجالس اور تقریبات میں گلچیرے اڑاتی ہے اور اپنا بہت سادقت جنسی افسانوں اور نادلوں کے

پڑھنے اور ریڈیو کے عشیقہ گانے سننے میں گزارتی ہے اس میں بلاشبہ مفروضہ جنسی جذبہ بھرک اٹھتا ہے مگر اس کی تسکین کی ذمہ داری نہ اسلام نے لی ہے اور نہ کوئی اور ہی لے سکتا ہے۔

بعض لوگ یہ بھی پوچھتے ہیں کہ اگر اسلام میں عورت کو ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت نہ دینے کی وجہ مرد کی غیرت ہے تو یہ غیرت تو عورت میں بھی موجود ہے بلکہ مرد سے کچھ زیادہ ہی ہے، پھر مرد کو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت کیوں دے دی گئی؟ آخر اس چیز کو عورت کی غیرت کس طرح برداشت کر سکتی ہے؟ یہ اعتراض محض اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ لوگ عورت کے لیے اس ممانعت کا سبب صرف مرد کی غیرت ہی کو سمجھتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کا سبب مرد کی غیرت بھی ہے اور عورت کی غیرت کے مقابل میں مرد کی غیرت چونکہ سخت جارحانہ مزاج رکھتی ہے اس وجہ سے وہ نسبتاً زیادہ قابلِ غلطی ہے، لیکن اس ممانعت کے اصل اسباب وہ ہیں جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ اس سے مقصود اختلاط سے معاشرہ کو بچانا ہے۔ اگر اختلاط نسب سے معاشرہ کو محفوظ نہ رکھا جائے تو پھر ہمارا معاشرہ انسانی معاشرہ نہیں رہے گا بلکہ حیوانی گلوں سے بھی بدتر ہو جائے گا۔

الغرض تعدد ازدواج کی اجازت کا کوئی ایک ہی سبب نہیں ہے بلکہ اس کے بہت سے اسباب ہیں جن کا صحیح صحیح اندازہ کوئی عدالت نہیں کر سکتی۔ شخص اپنے متعلق زیادہ بہتر طریقہ پر خود ہی فیصلہ کر سکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ چونکہ عام طور پر لوگ ان شرائط کی پابندی نہیں کر رہے ہیں جو تعدد ازدواج پر اسلام نے عاید کی ہیں اس وجہ سے حکومت کا حق ہے کہ وہ اس اجازت پر مزید پابندیاں عائد کر دے یا اس اجازت کو سرے سے منسوخ ہی کر دے تو یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

اولاً تو ایک چیز پر اسلام نے جو شرطیں عائد کی ہیں ان کے علاوہ اس پر مزید شرطیں عائد

کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ اہتمام اس کا کرنا چاہیے کہ جو شرطیں اسلام نے عائد کی ہیں وہ پوری کی جائیں نہ کہ ان پر کچھ اور قیدوں اور شرطوں کا اضافہ کیا جائے۔ اگر خیال یہ ہے کہ ان اضافوں کے بغیر اسلام کی عائد کردہ شرطیں پوری کرائی نہیں جاسکتیں تو یہ اسلام کا نقص میرا۔ اور کس بات کو صرف وہی لوگ صحیح مان سکتے ہیں جو اسلام کو ایک دین کامل نہ مانتے ہوں۔ اسی طرح کے اضافوں سے تو یہودیوں نے اپنی شریعت کو اصر و اعتلال کا ایک مجموعہ بنانے کا رکھ دیا۔ اور حضرت نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں سے ایک اہم مقصد ان اصر و اعتلال سے دنیا کو نجات دینا بھی تھا۔ کمیشن ایک طرف تو یہودیوں کی اس ریش پر قائم کرنا ہے اور دوسری طرف اسی یہودیت کی پیروی خود کر رہا ہے۔

اسلام نے اضطراب کی حالت میں کوئی حرام چیز کھانے کی اجازت دی ہے، لیکن یہی اجازت کے ساتھ بغیر باغ و لا عادی کی قید بھی لگائی ہے۔ یعنی کوئی شخص اگر حرام کھانے پر مجبور ہی ہو جائے تو نہ تو وہ اس حرام چیز کو خواہش اور رغبت کے ساتھ کھائے اور نہ سرد رہتی سے زیادہ کھائے۔ معلوم ہے کہ بہت سے لوگ اس شرط کا اہتمام نہیں کرتے بلکہ کسی معمولی سے عذر کو بھی بہانہ بنا کر خدا کی اس قائم کردہ حد سے بالکل بے پروا ہو جاتے ہیں۔ اب کیا یہ بات جائز ہوگی کہ ایک قانون بنا دیا جائے کہ کوئی شخص جب تک سرکاری ٹاکس یا کسی دوسرے سے اضطراب کا سرٹیفکیٹ نہ حاصل کرے اس وقت تک وہ اس اجازت سے فائدہ نہ اٹھائے؟

اسلام نے بعض حالتوں میں دھوکے جگہ تیمم کی اجازت دی ہے۔ معلوم ہے کہ بہت سے لوگ اس اجازت سے بھی غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کیا اس کے سد باب کے لیے ایک مزید قید لگائی کر دیا جائے کہ جب تک قاضی شہر کسی شخص کو تیمم کی اجازت نہ دے اس وقت تک کوئی شخص تیمم کی اجازت سے فائدہ نہ اٹھائے۔ اسلام نے میاں پوری کو اجازت دی ہے کہ ایک ہر

مقرر ہو جانے کے بعد اپنی باقی رضا مندی سے اس میں کمی بیشی کر سکتے ہیں۔ معلوم ہے کہ اس باقی رضا مندی پر بسا اوقات کچھ رسم و رواج وغیرہ اور بعض دوسرے عوامل بھی اثر انداز ہو جاتے ہیں جس سے رضا مندی حقیقی رضا مندی باقی نہیں رہتی۔ کیا اس کی وجہ سے یہ بات جائز ہوگی کہ اس معاملہ کو بھی اٹھا کر عدالت کے حوالہ کر دیا جائے کہ حجب تک وہ اس رضا مندی کو رضا مندی تسلیم کرے اس وقت تک فریقین کو باہم کوئی تصفیہ کرنے کا حق نہ ہو۔

ثانیاً غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ اگر لوگ اسلام کی اس اجازت سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں تو کیوں اٹھا رہے ہیں؟ کیا اسلام کی یہ اجازت ہی غلط ہے؟ یا اس نے جن شرائط سے اس کو مشروط کیا ہے وہ شرطیں ہی ناکافی اور ناقص ہیں؟ یا اس کے اسباب کچھ اور ہیں؟ جہاں تک اجازت اور اس کے شرائط کا تعلق ہے کمیشن نے (باید ناخوارستہ ہی) اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ اجازت مصلحت پر مبنی ہے اور اس کی شرطیں بھی عورت کے حقوق کے لیے ناکافی نہیں ہیں۔ البتہ اس کو یہ شکایت ہے کہ لوگ اس اجازت سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اس کی شرطیں پوری نہیں کر رہے ہیں۔ اب آئیے غور کیجیے کہ اگر لوگ یہ شرطیں پوری نہیں کر رہے ہیں تو کیوں نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی دو وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ عام جہالت کے سبب سے نہ عورتوں کو اپنے حقوق کا علم ہی ہے اور نہ ان کے تحفظ کا احساس ہی ہے۔ انگریزوں کے دور حکومت میں تو اس علم و احساس کے پیدا ہونے یا پیدا کیے جانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوا تھا۔ انھوں نے تو ملک کے ایک شعبے حصہ میں عورتوں کو بالکل برادریوں کے رسم و رواج پر چھوڑ رکھا تھا جس کے سبب سے وہ مہذب عورتوں کی طرح بالکل اپنے خاندانوں کے رحم و کرم پر بھٹتی۔ نہ ان کے کوئی حقوق تھے اور نہ ان کے اندر حقوق کا احساس پیدا کرنے کی کسی کو فکر ہی تھی۔ پاکستان

بخش کے بعد خدا کا کر کے اتنا ہوا کہ ملک کے اکثر حصوں میں میراث سے متعلق اسلامی قانون نافذ ہو گیا لیکن ان کے اندر حقوق کا احساس پیدا کرنے کے لیے حکومت کی سرپرستی میں اگر کوئی کام ہوا ہے تو وہ اپنا کی تنظیم ہے جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عورتوں میں بے پردگی اور بے حیائی پھیلانے کے لیے اور ان کو مغربی عورتوں کی ریس کرنے کی تربیت دی جائے، اور یہ کام بھی زیادہ تر اونچے درجہ کے خاندانوں کی بیگمات کے اند ہی ہوتا ہے۔ اس تنظیم کے ذریعہ سے اگر عورتوں کو کوئی سبق ملتا ہے تو یہ ملتا ہے کہ انھیں پرہیزگس طرح کرنی چاہیے اور اسلامی کس طرح دینی چاہیے۔ یہی بات کہ اسلام میں ان کے حقوق و فرائض کیا ہیں تو اس پر وہ غور کرنا اس وجہ سے غیر ضروری خیال کرتی ہیں کہ اسلام ان کے نزدیک خود ایک بیماری سے جس کو جلدی سے جلدی دو کرنے کی وہ کوشش کر رہی ہیں۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کسی میں اپنے حقوق کا احساس بھی ہو تو اس ملک میں اس کے حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں اگر بزرگوں نے جو عدالتی نظام قائم کیا تھا (اور وہ اب تک جاری ہے) اس کے متعلق کمیشن نے خود نہایت پرسوز الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ اس سے کسی مظلوم اور غریب کے لیے انصاف حاصل کرنا ناممکن ہے۔ اگر کبھی اپنا حق حاصل کرنے کے لیے کسی مظلوم عورت اور اس کے او بیامنے ان عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹایا بھی تو مدتوں کی درپازہ گئی اور ذلت و خواری کے بعد نقصان مایہ و ثمت ہمایہ کے سوا کچھ پے نہ پڑا۔ ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ اسلام کے یہ قوانین اس زمانہ میں مجباً تھے حیثیت نبی میں اسلام کا نظام قائم تھا۔ آخر اس زمانہ میں تعدد ازواج کی عام اجازت کے باوجود کسی مرد کی یہ حرات کیوں نہ ہو سکی کہ وہ کسی عورت کا کوئی معمولی سے معمولی حق بھی تلف کر سکے۔ ہر شخص کو پتہ تھا کہ اگر اس نے کوئی زیادتی کی تو اس حکومت میں اس کی یہ زیادتی اس کے لیے منگنی پڑے گی۔ اس نظام حکومت کا مزاج

یہ ہے کہ اس میں ایک بے اثر سے زیادہ با اثر کوئی نہیں ہے اگر وہ مظلوم ہے اور ایک با اثر سے زیادہ بے اثر کوئی نہیں ہے اگر وہ ظالم ہے اس میں ایک کمزور سے کمزور عورت کے لیے بھی نہ صرف قاضی القضاۃ کی عدالت عالیہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں بلکہ خود ریاست کے باغیالی پر بھی وہ جیب چاہے دستک دے سکتی ہے، اور کسی صاحب و دربان کی مجال نہیں ہے کہ اسے روک سکے۔

پھر ہر شخص کو یہ بھی پتہ تھا کہ ہر عورت یہ جانتی ہے کہ اسلام نے اس کو کیا حقوق دیئے ہیں اور اس پر کیا کچھ ذمہ داریاں ڈالی ہیں۔ اس وجہ سے آسانی کے ساتھ اس کے حقوق غصب کرنے کی کوئی شخص حرات نہیں کر سکتا تھا۔ عورت کوئی کورٹ نہیں داخل کیے بغیر کسی درخواست پر کوئی شائبہ لگائے بغیر اور کسی وکیل صاحب کی جیبیں گرم کیے بغیر اپنا مقدمہ خود لڑ سکتی تھی اور اگر عدالت اس کے مقدمہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے کسی مدد کی محتاج ہوتی تھی تو اس کا بوجھ اس پر ڈالے بغیر خود اس کا انتظام کر لیتی تھی۔ اگر عورتوں کے اندر ان کے حقوق کا علم و احساس آج بھی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور حقوق حاصل کرنے کا انتظام بھی سنا اور سہل مہیا کر دیا جائے تو کس کی مجال ہے کہ وہ اسلام کی ایک اجازت سے فائدہ نہ اٹھائے لیکن اسلام نے اس سلسلہ میں اس پر جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں وہ پوری نہ کرے۔

کمیشن نے اپنے نقطہ نظر کی حمایت میں ایک کلمہ یہ بھی بیان کیا ہے کہ بیماری کا رستہ کھول دینے کے بعد علاج کا مشورہ دینے سے زیادہ دانش مندانہ طریقہ یہ ہے کہ سر کے بیماری کے اسباب ہی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ کمیشن کا مطلب یہ ہے کہ تعدد ازواج کی اجازت دے دینے کے بعد اس کے سبب سے پیدا شدہ نا انصافیوں کے ازالہ کی تدابیر سوچنے کے بجائے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس اجازت ہی پر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں کہ

کسی تعدی یا نا انصافی کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو۔ یہ نکتہ ہے تو لطیف لیکن کمیشن نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ خود تعدد ازدواج کی اجازت بھی درحقیقت بہت سی اجتماعی، عائلی اور شخصی بیماریوں کے سبب اب کے لیے ہے اگر آپ نے تعدد ازدواج سے پیدا شدہ بیماریوں کے علاج کے لیے سرے سے تعدد ازدواج ہی کو کا عدم قرار دے دیا تو پھر آپ کے معاشرہ میں، آپ کے خاندانوں میں اور آپ کی قوم میں وہ ساری بیماریاں پھوٹ پڑیں گی جن کو یہ تعدد ازدواج کی اجازت روکے ہوئے ہے لیکن کمیشن کو ان وباؤں کی کوئی فکر اس وجہ سے نہیں ہے کہ جدید تہذیب میں یہ دباؤں رحمتیں اور برکتیں بھی جاتی ہیں، کمیشن کی دلی آرزو ہے کہ یہ رحمتیں اور برکتیں زیادہ سے زیادہ مقدار میں پاکستان میں برسوں اور لگ ان سے فیض یاب ہوں۔

یہاں تک ہم نے ان دلائل کا جائزہ لیا ہے جو کمیشن نے اپنی سفارش کی تائید میں پیش کیے ہیں۔ اب ہم وہ نتائج پیش کرنا چاہتے ہیں جو کمیشن کی اس سفارش کے قانون کی صورت اختیار کر لینے کے بعد سامنے آئیں گے۔

۱۔ جب کسی شخص کے لیے اس بات کا امکان باقی نہیں رہے گا کہ وہ حب تک اپنی پہلی کو بکھیر یا مدقوق یا فائز العقل نہ ثابت کر دے اس وقت تک دوسری شادی کر سکے تو لازماً دوسری شادی کے خواستہ مندوں کا رجحان یہ ہوگا کہ وہ کسی طرح اپنی پہلی بیویوں سے جان چھڑائیں اور اس کا ممکن راستہ جو وہ سوچ سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ ان کو طلاق دے دیں۔ اس طلاق کی راہ میں اگرچہ کمیشن نے بہت سی رکاوٹیں ڈال دی ہیں، مثلاً یہ کہ اگر کوئی شخص بغیر کسی سبب معقول کے طلاق دے تو اس پر عورت کے عقد نامی یا مدت تک کے لیے اس کی کفالت کا بار ڈالا جاسکتا ہے۔ لیکن ان رکاوٹوں کے باوجود نکاح

جدید کے شوقین یا ضرورت مند راہ نکاح ہی لیں گے۔ اگرچہ انھیں اس مفہم کے لیے پہلی بیوی پر عداوت رسوائی کرنا پڑے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ بہت سی عورتیں جو آج اپنے گھروں میں رہ بس رہی ہیں وہ مطلقہ ہو کر اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوں گی اور مطلقہ بھی بدنام اور عدالت سے مستند مطلقہ جن سے کوئی دوسرا مرد نکاح کرنے کی جرأت مشکل ہی سے کر سکے گا۔ ۲۔ اگر کوئی شخص اپنی پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسرا نکاح کرنا چاہے گا اور عدالت اس کے بیان کردہ وجوہ کو نا کافی سمجھ کر اسے ایسا کرنے کی اجازت نہ دے گی تو قانون کی اس مزا حمت سے مجبور ہو کر وہ اپنے ارادہ نکاح سے تو باز آجائے گا لیکن اپنی بیوی کو اپنے لیے ایک لعنت کا طوق کھینچے لگے گا۔ یہ عورت اس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھنکھنے لگی اور حبیب بھی اس کے چہرے پر اس کی نظر پڑے گی وہ یہ خیال کرے گا کہ یہی بکھیرا ہے جس کے سبب وہ اپنے ایک جائز ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن ہے بعض قانونی رکاوٹوں یا کسی ذاتی اور خاندانی مصلحت کی وجہ سے وہ اس کو طلاق نہ دے، لیکن بیوی صاحبہ کو کھوٹے ہی عرصہ میں یہ تجربہ اچھی طرح پہنچے گا کہ شوہر کی محبت عدالت اور قانون کے زور سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ شوہر کے دوسرا نکاح کر لینے کے بعد تو اس کا امکان باقی تھا کہ وہ اس کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنے کی کوشش کرنا اور اگر زیادہ خیال نہ کرتا تو کم از کم اس کے ساتھ انصاف ہی کرتا، لیکن اس صورت حال کے پیدا ہو جانے کے بعد تو وہ اس کو اپنی راہ کا صرف ایک پتھر ہی سمجھے گا۔ اور ہر وقت اس کی دلی آرزو یہی ہوگی کہ کب یہ پتھر اس کے راستے سے ہٹے۔

۳۔ اور اگر وہ شخص شریعت اور اخلاق کی پابندیوں سے بالکل آزاد ہوگا اور اس زمانہ میں زیادہ انخاص ایسے ہی ہوں گے تو وہ اپنی خواہشوں کی تکمیل کے دوسرے ناجائز راستے پیدا کرے گا۔ اور یہ راستے اس زمانہ میں ہر طرف کھلے ہوئے ہیں۔ وہ بیوی تو ایک ہی رکھے گا،

لیکن تعلقات دوسری کسی اور عورت یا کئی عورتوں سے پیدا کرے گا، ان کے پیچھے اپنا ایمان و اخلاق برپا کرے گا، اپنی عزت و شہرت تباہ کرے گا، اپنے بیوی بچوں سے غفلت برتے گا۔ اور اپنا مال دوسری جگہ ٹائے گا۔ بیوی صاحبہ اس پہلو سے تو شاید مطمئن ہوں کہ گھر میں کوئی باضابطہ سوکھن وہ نہیں لاسکا، لیکن حقیقت یہ ہوگی کہ نہ جانے کتنی ناجائز سکونیں شوہر کے دل اور اس کے مال میں ان کی شریک بن جائیں گی اور اس وقت کوئی صاحب نہ تو ان سوکھوں سے نجات دلانے کے لیے سامنے آئیں گے اور نہ ان کے مقابل میں مایاں کی تنخواہ کا کوئی حصہ ان بیوی اور ان کے بچوں کے لیے مخصوص کر سکیں گے۔

۴۔ مردوں کی اس آزادی کا جو اثر عام معاشرہ پر پڑے گا وہ تو پڑے ہی گا، اس کا سب سے زیادہ خطرناک اثر گھروں پر پڑے گا۔ جن گھروں کے مرد یہ روش اختیار کریں گے ان گھروں کی عورتیں بھی آہستہ آہستہ اسی راہ پر چل پڑیں گی۔ جیب وہ دیکھیں گی کہ میاں نے اپنی دل بستگی کے سامان اور پیدا کر لیے ہیں تو وہ بھی اپنی دل بستگی کے دوسرے سامان تلاش کرنے لگیں گی بلکہ یہ شروع شروع میں کچھ حجاب سامو، لیکن زیادہ زمانہ نہیں گزرے گا کہ وہ اپنے شوہروں سے بھی زیادہ بیباک ہو جائیں گی اور پھر ان کی اولاد کے لیے تو سب سے زیادہ جانی ہچانی راہ یہی ہوگی۔ الغرض زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ مغربی معاشرہ کی تمام لعنتیں ہمارے معاشرہ پر بھی اس طرح مسلط ہو جائیں گی کہ پھر ان سے چھٹکا حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔

۵۔ یہ قانون، تعدد ازواج کی پرائی کو (اگر وہ برائی ہے) تو روکنے میں ذرا بھی کامیاب نہیں ہوگا، البتہ بہت سی عورتوں کو عدالتوں سے پاگل اور مدقوق ہونے کا سرٹیفکیٹ دلوادے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ کے غریب طبقوں میں تو تعدد ازواج کا رواج بہت کم۔ بلکہ مفقود ہے۔ یہ رواج زیادہ تر، بلکہ تمام تر خوشحال طبقہ میں پایا جاتا ہے۔ یہ قانون

اس طبقے کو اس اجازت سے فائدہ اٹھانے میں مایع نہیں ہو سکتا کیونکہ کمیشن نے اس کے لیے دو شرطیں رکھی ہیں اور ان دونوں شرطوں کو پورا کرنا غرباء اور عوام کے لیے تو بے شک ناممکن ہے لیکن خوشحال لوگ بڑی آسانی کے ساتھ یہ دونوں شرطیں پوری کر سکتے ہیں۔ ایک شرط تو یہ ہے کہ دوسری شادی کا خواہشمند عدالت کے سامنے یہ ثابت کر سکے کہ وہ "دونوں کنہوں کی کفالت کا بندوبست ان کے معیار زندگی کے مطابق کر سکتا ہے۔ دوسری یہ کہ وہ اپنی موجودہ بیوی کو بالکل یا مدقوق یا پاگل ثابت کر دے جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے، اس کی ضمانت دے دینا تو کسی خوشحال آدمی کے لیے کوئی مشکل ہے ہی نہیں۔ رہی دوسری چیز تو کسی دماغی امراض کے ہسپتال یا کسی ڈاکٹر سے بیوی کے لیے مدقوق یا پاگل ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لینا اس زمانہ میں کسی صاحب مال کے لیے کیا مشکل ہے۔

یہ نہ خیال کیجیے کہ میں محض صورتِ حال کو خوفناک دکھانے کے لیے یہ قیاس کے گھوٹے دوڑا رہا ہوں بلکہ اس طرح کے واقعات ہمارے ہاں ہوتے رہتے ہیں۔ آج اگر کم سو رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ضرورت کم پیش آتی ہے۔ لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہے، جب اس کی ضرورت پیش آئے گی تو آپ یقین کریں کہ اس کی بہت سی راہیں کھل جائیں گی۔ اب کچھ زیادہ صبر نہیں گزرا ہے کہ اخبارات میں یہ خبر چھپی تھی کہ ایک صاحب اپنی بیوی کو تو بوجھاری اچھی خاصی تندرست تھی کار میں لاد کر لاہور میں مینٹل ہسپتال میں اس کے پاگل ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے لے جا رہے تھے اور وہ غریبہ چیخ چیخ کر فریاد کر رہی تھی کہ یہ ظالم مجھے دیوانی ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ میں بالکل تندرست اور عموماً دھواں سے ہوں۔ لیکن شوہر صاحب اور ان کے مددگار انرا اس کی چیخ و پکار دیکھ کر اس کے پاگل ہونے کے ثبوت میں بطور دلیل پیش کر رہے تھے۔ لاہور کے ایک معاصر نے اس واقعہ کا حوالہ دے کر مجھ سے یہ سوال کیا ہے کہ اگر میں کمیشن کی ان

سفارشات کا مذہب کے خلاف ہونے کے سبب سے مخالف ہوں تو مردوں کے اس طرح کے
مظالم کے سدباب کی میرے نزدیک کیا تدبیر ہے؟ حالانکہ یہ سوال عجیب سے پوچھنے کا نہیں،
بلکہ کمیشن کے ارکان سے پوچھنے کا ہے۔ جنہوں نے بڑی کاوش سے اپنی مزید بہت سی باتوں کو
پاگل بنانے کی یہ راہ گھولی ہے۔ باہر لوگوں کی ان بیگمات سے پوچھنے کا ہے جو کمیشن کی اس
رپورٹ پر سرد صحن دی جی اور بے قرار ہیں کہ ان کی آزادی کا یہ چارٹرک سفارشات کے
ذریعہ سے ترقی کر کے قانون کا مرتبہ حاصل کرے گا۔

مہر کے متعلق کمیشن کی سفارشات یہ ہے کہ معاہدہ ازدواج میں جو مہر بھی درج ہو
خواہ اس کی مقدار کتنی ہی زیادہ ہو۔ ازدواجی قانون واجب الادا قرار دی جائے۔

اس سفارشات کی دلیل میں یہ بات کہی گئی ہے کہ بعض اوقات مہر کے مقدمات میں مرد کی
طرف سے بہت زیادہ دی کی جاتی ہے کہ نکاح نامہ میں مندرج مہر محض فرضی ہے، خرفیقین میں
یہ بات طے غنی کہ اس کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ کمیشن مرد کی اس قسم کی جواب دی کے سدباب کے
لیے چاہتا ہے کہ نکاح نامہ کے مقرر کردہ مہر کو واجب الادا قرار دے دیا جائے تاکہ اس نوعیت
کی کسی مقدمہ بازی کے لیے کوئی بنیادی باقی نہ رہ جائے۔

جہاں تک قانون کا تعلق ہے اس کا تقاضا تو بلاشبہ یہی ہے کہ جو مہر طے پایا ہے وہ
شوہر پر واجب الادا ہو۔ لیکن کمیشن نے اپنی اس رپورٹ میں بار بار غفل اور انصاف کا بھی حوالہ
دیا ہے اور معاشرہ میں جو غلط چیزیں رواج پاگئی ہیں ان کی اصلاح کے عزم کا بھی اظہار فرمایا
ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غفل و انصاف کے تقاضے اور اصلاح کے سارے عزائم ارکان کمیشن کے
صرف اسی وقت تک یاد رہتے ہیں جب تک بات عورت کے حق میں جاری ہو اگر عورت کے
حق میں نہ جاری ہو تو پھر بڑی سے بڑی غلطی بھی کمیشن کی نظر میں غفل و انصاف کے مطابق

بن جاتی ہے اور معاشرہ کی اصلاح کے نقطہ نظر سے بھی وہی چیز ضروری ہو جاتی ہے۔
ہر شخص جانتا ہے کہ مہر کے معاملہ میں اسلام کا اہل رجحان یہ ہے کہ مہر خرفیقین کی حیثیت
کے مطابق ہو اور اس کو ملا وجہ سخت اور تقاضے کے اظہار کا ذریعہ نہ بنایا جائے لیکن مہر
معاشرہ اس بارہ میں ایک بالکل غلط راہ پر چل پڑا ہے اور یہ غلطی کسی ایک ہی فریق کی طرف سے
نہیں ہوتی ہے بلکہ لڑکی والوں اور لڑکے والوں دونوں ہی کی طرف سے ہوتی ہے کبھی تو لڑکی والے
اپنی امارت کی دھونس جمانے کے لیے یا کسی مقابلہ کے جذبہ کے تحت زیادہ مہر باندھنے کی خود
پیش کش کرتے ہیں اور کبھی لڑکے کو باندھنے کی نیت سے لڑکی والے بھاری مہر باندھنے کا
مطالبہ کرتے ہیں اور اس پر اس قدر لہجہ ہوتے ہیں کہ چارہ ناچار اس کو ان کا یہ مطالبہ ماننا پڑتا
ہے۔ اگر وہ نکاح سے انکار کر کے واپس لوٹ آتا ہے تو شدید مالی نقصان کے علاوہ برادری
میں اس کی ناک کشی ہے اور اگر مطلوبہ مہر پر راضی ہوتا ہے تو اپنے پاؤں میں از خود ایک بھاری
زنجیر پہنتا ہے۔ ایسی صورتوں میں عموماً لڑکے والوں کا رجحان یہی ہوتا ہے کہ بارات کو نکاح کے
لیغیر ٹھانہ پڑے اگرچہ مہر کتنا ہی بھاری ہو۔ وہ اس شکل پر برداشت اس امید پر راضی ہو جاتے
ہیں کہ آئندہ شاید مہر دینے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے۔

اب عقل و انصاف اور اصلاح معاشرہ کے نصب العین کا تقاضا تو یہ ہے کہ کوئی
ایسی شکل نکالی جائے جس سے عورت کی حق تلفی بھی نہ ہو، اور اس معاملہ میں جو غلطیاں ہوئی
ہیں ان کی بھی اصلاح ہو سکے۔ مہر بوری کے تعلقات کی خوشگوار کی صورت میں تو وہ
خود ہی ان نامحوریوں کو محو کر سکتے ہیں لیکن حیب معاملہ بگڑ کر عدالت میں جا پہنچے تو پھر تو
واحد صورت اصلاح کی یہی باقی رہ جاتی ہے کہ اگر مہر اتنا باندھا یا بندھا یا لیا گیا ہے جس کی
ادائیگی مرد کے امکان سے باہر ہے، یا اس کی ادائیگی کے بعد وہ مالی اعتبار سے بالکل تباہ

ہو کر رہ جاتا ہے تو عدالت اس میں مداخلت کر کے کوئی منصفانہ شکل پیدا کرے۔ لیکن کمیشن نے یہاں عدالت کے ہاتھ باندھ دیئے ہیں اور از روئے قانون اس کو پابند کر دیا ہے کہ جو مہر نکاح نامہ میں درج ہے وہ اس کی ڈگری دے، اگرچہ شوہر کی سات پشتیں بھی اس کی ادا کرنے پر قادر نہ ہو سکیں۔ یہ ہمارے نزدیک عورت کے حقوق کی حفاظت نہیں بلکہ "عورت نوکیلا" کی بیماری ہے جس نے دماغوں کو اس قدر ماؤف کر دیا ہے کہ ان لوگوں کو عورت کے رسوا دنیا میں اور کسی کا حق نظر ہی نہیں آتا۔

ہر کے متعلق ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ چونکہ یہ مرد کو ادا کرنا ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی خواہش ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ یہ زیادہ نہ ہو۔ ایسا ہی کوئی شیخی باز مرد ہوگا جو اس کی زیادتی پر راضی ہو۔ اس کی زیادتی کے لیے اصرار اکثر عورت کے خاندان والوں کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کا سبب بیشتر مرد کو اچھی طرح باندھنا ہوتا ہے۔ ضرورت تھی کہ اس غلط رجحان کی روک تھام کی جاتی لیکن کمیشن کی کوشش یہ ہے کہ یہی غلط رجحان اس ملک کا معروف بن جائے اور ہر لڑکی والے کی کوشش یہی ہونے لگے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مہر بندھوا کر داماد کو اپنا زرخیز غلام بنالے۔ ہمارے ملک میں بہت سے غلط رجحانوں کے جڑ پکڑ جانے سے نکاح کا معاملہ یوں بھی خاصا مشکل بن چکا ہے لیکن کمیشن کی یہ سفارش تو اس کو اتنا مشکل بنا دے گی کہ عام آدمی کچھ عرصہ کے بعد شاید نکاح کی تمہت ہی نہ کر سکے گا۔

حضانت | موجودہ قانون کی رو سے چھوٹے بچوں کی حضانت کا حق خاص عمروں تک ماں کو حاصل ہے۔ لڑکا ہو تو سات سال اور لڑکی ہو تو بلوغ تک۔ اس بارہ میں کمیشن کا رجحان یہ ہے کہ چونکہ عموماً کا یہ تعین نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں بلکہ یہ محض فقہاء کے اجتہاد و استنباط پر مبنی ہے اس وجہ سے اس میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس معاملہ پر بھی غور

کرتے وقت کمیشن نے نہ تو شریعت کو پیش نظر رکھا ہے اور نہ عقل و انصاف کو بلکہ وہ اسی "عورت نوکیلا" کے مرض کا شکار ہو گیا ہے جو دوسرے مسائل پر غور کرتے وقت اس پر طاری رہا ہے۔

اس میں تو شبہ نہیں کہ عموماً کا یہ تعین کسی آیت یا کسی حدیث میں صاف الفاظ میں مذکور نہیں ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ فقہانے پس یونہی جو امی تیر چلائے ہیں اور ان کے انتہا پر کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ انھوں نے اس مسئلہ پر جو رائیں قائم کی ہیں وہ ان مقدّمات پر مبنی ہیں جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوئے ہیں اور جن کے اپنے فیصلے فرمائے ہیں۔

ان تمام فیصلوں پر نگاہ ڈالنے کے بعد جہاں عموماً کے تعین کے لیے مواد ملتا ہے وہیں یہ حقیقت بھی بالکل واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اس معاملہ میں ایک نہایت اہم قابل لحاظ چیز بچوں کی بہبود اور ان کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ بھی ہے۔ اگر ان کی دیکھ بھال اور تربیت بہتر طریق پر مال کی نگرانی میں ہونے کی توقع ہے تو بچوں کی ماں کی نگرانی ہی میں رہنا چاہیے، یہ بات جذبات کے پہلو سے بھی بہتر ہے اور شریعت کے نقطہ نظر سے بھی۔ لیکن اگر ماں بدسلوکی ہے، یا بدچلن ہے، یا مخالف اسلام ہے، یا کتا بیہ ہے یا کافرہ ہے تو ان صورتوں میں بچوں کو اس کے حوالہ کر دینا شریعت کے بھی خلاف ہے اور عقل و انصاف کے بھی خلاف۔ ان صورتوں میں اگر مطالبہ کیا جاسکتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اس بات کا کیا جاسکتا ہے کہ اس کے بچوں سے ملنے پر کوئی رکاوٹ نہ عائد کی جائے لیکن بچے اگر اس کی تحویل میں دے دینے پر مرد مجبور کر دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اپنے بچوں کو خود اپنے خرچ پر بدر اخلاق و بے دین بنائے۔ صاحب نیل الاوطار اس باب کی تمام احادیث پر بحث کرنے اور فقہاء کے مختلف مذاہب بیان کرنے کے بعد آخر میں نہایت عمدہ بات لکھتے ہیں

وہ ملاحظہ ہو :-

”بچوں کو ماں یا باپ میں سے کسی ایک کے انتخاب کا اختیار دینے یا قریب سے فیصلہ کرنے سے پہلے ان کے مفاد پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اگر ماں اور باپ میں سے کسی ایک کے بارے میں یہ بات معلوم ہو جائے کہ تربیت و اصلاح کے نقطہ نظر سے اس کی نگرانی بچوں کے لیے زیادہ نافع ہے تو پھر قرعہ یا بچے کے انتخاب پر معاملہ کو چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ یہ پہلو مقدم رکھا جائے گا۔ یہی رائے علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ انھوں نے اپنے اس مسلک کی تائید میں **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ كَمَا تَقُونَ أَهْلِيكُمْ نَارًا** (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ) اور اس مضمون کی دوسری آیات اور احادیث سے استدلال کیا ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حسن لوگوں نے قرعہ یا بچہ کے میلان کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی رائے دی ہے ان کی یہ رائے مذکورہ شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اپنے استاد علامہ ابن تیمیہ کی زبانی انھوں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بچہ کے والدین نے اسی طرح کا ایک مقدمہ عدالت میں پیش کیا۔ عدالت نے بچہ کو اختیار دیا کہ وہ ماں یا باپ میں سے جس کو منتخب کرے اس کے ساتھ چلا جائے۔ بچہ نے باپ کو ترجیح دی۔ اس پر ماں نے عدالت کو توجہ دلائی کہ وہ بچہ سے معلوم کرے کہ وہ باپ کو کیوں ترجیح دے رہا ہے۔ عدالت نے بچہ سے پوچھا کہ تم اپنے باپ کے ساتھ کیوں رہنا پسند کرتے ہو؟ بچہ نے جواب دیا کہ ماں مجھے ہر روز مکتب جانے پر مجبور کرتی ہے اور مکتب کا ملا مجھے ہر روز سزا دیتا ہے۔ برعکس اس کے ایا جان مجھے بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے چھوڑ

دیتے ہیں۔ عدالت نے یہ سن کر بچہ ماں کے حوالہ کر دیا۔ ذیل الاطرح ۶ ص ۱۵۳ کمیشن نے آخر اس نہایت معقول بات کو کیوں نظر انداز کر دیا؟ بیوی کے لیے مشروط مہر | کمیشن نے سفارش کی ہے کہ یہ بات از روئے قانون جائز کر دی جائے کہ کوئی بے اولاد شخص اپنی جائداد بیوی کے نام میں شرط کے ساتھ مہر کر سکتا ہے یا مرتے وقت اس کی وصیت کر سکتا ہے کہ اگر بیوی کا انتقال اس سے پہلے ہو جائے تو وہ جائداد اس کو واپس ہو جائے گی اور اگر بیوی کا انتقال اس کے بعد ہو تو جائداد واپس درجہ اولیٰ ہو جائے گی۔

اگرچہ مالکیہ کے نزدیک مدۃ العمر کا مہر جائز ہے، اور بطور اس میں کوئی مباحثہ نظر نہیں آتی کیونکہ ایک شخص اپنی جائداد کے اندر بیع مہر اور عین کے سائے حقوق و اختیارات رکھتا ہے۔ لیکن جہاں تک ایک شخص کے شرعی وارثوں کا تعلق ہے ان کے درمیان شریعت الہی کے خلاف کسی تفریق و ترجیح کو میں مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر صحیح نہیں سمجھتا۔ ۱۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ قرآن حکیم نے تقسیم جائداد کے لیے جو ضابطہ بنا دیا ہے اس میں ایک اصول یہ رکھا ہے کہ شرعی وارثوں میں کسی کو محض اپنے ذاتی رجحانات کی بنا پر کسی دوسرے پر ترجیح نہ دی جائے۔ یہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ کون فی الحقیقت اس کے لیے زیادہ نافع ہے اور کون کم نافع ہے، اسی چیز کو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی کو اپنے ذاتی میلانات کی بنا پر کسی پر ترجیح دے دیں لیکن وہ بالآخر ہمارے لیے زیادہ برائیاں بنے ہو۔ وہ جائداد پالینے کے بعد ہمارا دشمن بن جائے یا اس جائداد کو پاکر اس کو ایسے کاموں میں استعمال کرے جو ہمارے لیے آخرت میں رسوائی کا سبب ہوں۔ اگر ایک شخص خدائی تقسیم کی رو سے ایک چیز پانا ہے تو اس کی ذمہ داری ہمارے اوپر نہیں ہے، لیکن اگر وہ چیز ہم

خود اس کو پکڑا تے ہیں اور خدا کی ہدایت کے خلاف وہ اس کو غلط استعمال کرنا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ یہ جرم خود ہمارے ہی حوالہ کیے ہوئے ہتھیار کے ذریعہ سے کرتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے یوں سمجھایا ہے لَا تَدْرُؤْنَ اَنْ يَّهْلِكُمْ اَوْ يَنْبَغِيَ لَكُمْ نَفْعًا فَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (تم اس بات کو نہیں جانتے کہ ان میں سے کون تمہارے لیے زیادہ نفع بخش ثابت ہوگا) ۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تقسیم وراثت کے متعلق ایک اصول قرآن نے یہ بیان فرمایا ہے کہ ہر ایک تقسیم کے سلسلہ میں کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس سے کسی شرعی وارث کو نقصان پہنچے۔ فرمایا ہے "مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ نُوْضِيْ لَكُمْ اٰیٰتٍ غَيْرِ مُضَارٍّ (بعد اس وصیت کے جو کی گئی ہو اور بعد ادا کے فرض کے بغیر نقصان پہنچائے ہوئے) ۱۲ انسار مذکورہ ہر وجہ یا وصیت میں صریحاً دوسرے جائز وارثوں کے لیے نقصان متصور ہے اس وجہ سے از روئے قرآن اس کو جائز نہ ہونا چاہیے۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اس طرح کے ترجیحی سلوک سے ان حقداروں کے دلوں میں نفرت اور انتقام کا جذبہ ابھرتا ہے جن کا حق تلف ہوتا ہے۔ اس کے سبب سے خاندانوں میں لڑائی شروع ہو جاتی ہے اور لبا اوقات مقدمہ بازی سے لے کر زہر خورانی اور قتل تک زوہمتیں پہنچتی ہیں۔ پھر اسلام کسی ایسے اقدام کو کس طرح رد رکھ سکتا ہے جو بالآخر ان نتائج پر منتهی ہو؟

۴۔ معاشی اعتبار سے بھی یہ چیز غلط اور مضر ہے کسی چیز پر اگر ایک شخص کا قبضہ محض عارضی ہو تو اس کے ساتھ اس کی دلچسپیاں بھی محض سرسری ہوتی ہیں۔ اس غفلت اور عدم اہتمام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جتنے دلدہ شے اس عارضی قبضہ کے نیچے رہتی ہے خراب ہوتی رہتی ہے یہاں تک کہ لبا اوقات وہ اپنے مستقل وارثوں کو اس وقت ملتی ہے جب کہ وہ

بالکل تباہ ہو چکی ہوتی ہے۔ اسلام نے مال کو قیاماً للناس قرار دیا ہے اور اس کو اس قسم کے تصرفات سے بچانے کی تاکید کی ہے جو اس کو نقصان پہنچانے والے ہیں۔ چونکہ مذکورہ ہر وجہ یا وصیت میں یہ تمام مفسد موجود ہیں اس وجہ سے میں اس کو صحیح نہیں سمجھتا۔

یتیم پوتے کی وراثت | یتیم پوتے کی وراثت کے معاملہ میں کمیشن نے فقہاء کے متفقہ مسلک کو دور جاہلیت کی یادگار اور ظلم عظیم قرار دیا ہے اور سفارش کی ہے کہ جلد سے جلد قانون کے ذریعہ سے اس ظلم کو خاتمہ کیا جائے مگر جس نظریہ کے تحت کمیشن نے یتیم پوتے کو وراثت میں حصہ دلانے کی سفارش کی ہے اس سے وہ سارے اصول منہدم ہو جاتے ہیں جو اسلام نے تقسیم وراثت کے لیے از روئے ہیں۔ یتیم پوتوں کے ساتھ کمیشن کو جو محدود دی ہے وہ بجائے خود نہایت اچھی چیز ہے لیکن اس محدودی کی یہی ایک شکل نہیں ہے کہ ان کے لیے اسلام کے سارے قانون وراثت کو دہم برہم کر دیا جائے۔ ایک عمدہ نظام میں یتیموں کی امداد اور بہبود کی صدمہ دوسری باعزت شکلیں ممکن ہیں بشرطیکہ حکومت کرنا چاہے۔ لیکن کمیشن کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یتیموں کی ساری مشکل کا واحد حل اگر کوئی ہے تو یہ ہے کہ ان کو داد کی جائداد میں سے حصہ دلوایا جائے چونکہ اس مسئلہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس وجہ سے میں یہاں اس پر کچھ لکھنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔

چند مشورے

کمیشن کی جو تجاویز غلط اور مضر ہیں ان کی غلطیاں اور ان کے نقصانات تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں جن تجاویز سے میں نے بحث نہیں کی ہے ان میں سے بعض تو مفید ہیں اور بعض اگرچہ مفید نہیں ہیں لیکن کچھ ایسی مضر بھی نہیں ہیں۔ کمیشن کی سب سے زیادہ مفید تجویز شادی بیاہ کی عدالتوں کے قیام سے متعلق ہے۔ یہ ایک ہی چیز اگر عمل میں آجائے تو ہزار خرابیوں کا علاج بن سکتی ہے۔ اگرچہ کمیشن نے اس کی جو شکل تجویز کی ہے اس میں بعض خلا محسوس ہوتے ہیں اور میں ان کی طرف اشارہ بھی کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس خیال سے غماض لیا کہ اگر اس تجویز نے عمل میں آجائے تو عمل میں آئے آئے یہ خلا خود بھر جائیں گے۔

اب میں چند باتیں اس ملک کے علمائے کرام اور اباب اقتدار اور ملک کی لیڈر خواتین کی خدمت میں الگ الگ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

علماء کی خدمت میں | حضرات علماء کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ اس ملک میں اب اسلام کے مستقبل کا انحصار بہت بڑی حد تک انہی کی یک جہتی، رواداری اور وسعت نظر پر ہے۔ اگرچہ مخالف اسلام عناصر اب یہاں کافی حد تک منظم ہو چکے ہیں اور اثر و نفوذ کے تمام وسائل و ذرائع انہی کے قبضہ میں ہیں تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اس ملک کے عوام اور یہاں کا ذہن طبقہ بحیثیت

عمومی ابھی اسلام ہی کے ساتھ ہے اور اگر اہل دین متحد ہو کر اسلام کے لیے کام کریں تو وہ انہی کا ساتھ دے گا۔ ہمارے ذہن طبقہ میں دیوبندیت اور بریلویت یا خفیت اور اہل حدیثیت کی گروہی قسم کی معرکہ آرائیوں کے خلاف تو ضرور بیزاری پائی جاتی ہے اور اس بات کا نہایت قوی اندیشہ ہے کہ اگر حبلہ اس کے تدارک کی کوئی شکل نہ پیدا ہوئی تو یہ چیز ان میں سے بہتوں کو خود اسلام سے بھی بدگمان کر دے گی لیکن خدا کے فضل سے ابھی اسلام کے خلاف ان کے اندر کوئی بے زاری نہیں پیدا ہوئی ہے اور اگر پیدا ہوئی ہے تو ابھی وہ ایک نہایت ہی محدود دائرہ کے اندر ہے جس کو اگر خود علماء کی غلطی سے مزید فساد نہ مل گئی تو امید ہے کہ وہ منقذی نہیں ہونے پائے گی۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل دین کی تمام نوجو گروہی تعصبات کو بھڑکانے کے بجائے لوگوں کے اندر نفس اسلام کی حقیقت کا شعور پیدا کرنے پر صرف ہو۔ جب بدقسمتی سے اس ملک میں خود اسلام ہی کو ایک مابہ انزعاء چیز بنادینے کے لیے سرگرمیاں جاری ہیں تو یہ کس قدر نا عاقبت اندیشی کی بات ہے کہ علماء ایسے مسائل پر مناظرے کی مجلسیں گرم کریں جن کی دین میں یا تو کوئی اہمیت ہی نہیں ہے اور اگر اہمیت ہے بھی تو بہر حال اتنی اہمیت نہیں ہے کہ ان کے لیے باہمی جنگ حیدال تک نوبت آجائے اور معاملات متحاذوں اور عدالتوں تک پہنچیں۔ اگر اس طرح کے مسائل کچھ لوگوں کے نزدیک اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ لازماً ان کو زیر بحث لانا ہی چاہتے ہیں تو وہ اس کے لیے علمی اور تنقیدی بحث و استدلال کی راہ اختیار کریں۔ زمانہ زمانہ کا طریق بحث و نظر الگ الگ ہوتا ہے۔ یہ زمانہ علمی بحث و استدلال کا زمانہ ہے اور اس طریقہ سے لوگوں کو کسی خیال یا نظریہ کا قائل اور معتمد بنایا جاسکتا ہے متناظر و مجادلہ کا طریقہ اس زمانہ میں سرگزشت کوئی مفید نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا۔ نئے ذہن کو تو یہ چیز بالکل ہی اپیل نہیں کرتی، بلکہ اٹھے اس کے اندر اس طرح کی چیزوں کے خلاف ایک بیزاری پیدا ہو چکی ہے، اور اگر ذہن طبقہ کے اندر کسی چیز کے خلاف بیزاری پھیل جائے تو پھر وہ انہی تک محدود نہیں رہتی

بلکہ وہ بہت جلدی علوم کے اندھ بھی اتر جاتی ہے۔

ہمارے علماء کو اسی امر دقتی سے بھی بے خبر نہیں رہنا چاہیے کہ مخالف اسلام طاقتیں ان کی اس طرح کی غلطیوں کو نہایت برائی کے ساتھ اپنے مقصد کو تقویت دینے کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔ پریس کے ذریعہ یہ چیزیں خوب اچھال جاتی ہیں اور زمین طبقہ پر یہ اثر ڈالا جاتا ہے کہ اگر اس ملک میں مذہب کو زیادہ اہمیت دی گئی تو اس کے نتیجے میں کچھ نکلیں گے۔ تاریخ نے اس سلسلہ میں ہمیں جو مفید درس دیئے ہیں ہم بڑے ہی نادان ہوں گے اگر ان کو فراموش کر دیں۔ مگر ہم اس طرح کی غلطیوں پر مصر رہے تو اس ملک میں مذہب کو ختم کر دینے کی ذمہ داری یہاں کے مخالفین اسلام پر نہیں بلکہ یہاں کے علماء پر عائد ہوگی۔ مخالفین تو اب تک ہر قسم کا ذمہ دہ اثر رکھنے کے باوجود خدا کے فضل سے ہر محاذ پر شکست ہی کھاتے رہے ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہی رہی ہے کہ علماء اور ملک کے علوم نے اب تک یک جہتی کا ثبوت دیا ہے لیکن مخالفین کی یہ شکست خدا نخواستہ فتح سے بھی بدل سکتی ہے اگر وہ اہل دین کو فرد علی سائل کی جنگ میں الجھا دینے میں کامیاب ہو جائیں۔

ہمارے علماء اس دقت بڑے ہی سخت اتمان میں ہیں۔ اسلامی قانون کے اجراء و نفاذ کے لیے ان کی تمام کوششیں بالکل بے اثر ہو کر رہ جائیں گی۔ اگر انھوں نے ہر قسم کے گروہی تعصبات اور تنگ نظریوں سے بالاتر ہو کر اصل دین پر نگاہ نہیں جمائی۔ آپ اپنے انفرادی دائرہ کے اندر جس مسئلہ کے چاہیں پیروں میں لیکن ملک کے ایک اعلیٰ اور معیاری قانون دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ پوری فقہ اسلامی پر بغیر کسی تعصب کے نگاہ ڈالیں اور اس کو بحیثیت مجموعی اپنا مشترک سرمایہ سمجھیں۔ فقہ حنفی ہو، یا فقہ مالکی، فقہ شافعی ہو، یا فقہ حنبلی، یہ سب ہماری اپنی ہی فہمیں ہیں اور جن بزرگ ہستیوں کی کوششوں اور کوششوں سے یہ وجود میں آئی ہے وہ سب ہمارے

مشترک ائمہ و علماء ہیں۔ ہم ان سب کا یکساں احترام کرتے ہیں اور ان کے اوپر یکساں اعتماد رکھتے ہیں۔ تبحر اور تقویٰ کے لحاظ سے یہ ائمہ ہماری تاریخ کے گل سرسبد ہیں اور ہم بلا کسی تفریق و تعصب کے ان سب پر فخر اور احسانِ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ان نے اپنے فضل خاص سے اس امت میں ایسے مجتہدین اٹھائے جن کے اجتہادی کارنامے رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔

ہم ان میں سے کسی کو بھی معصوم اور تنقید سے بالاتر نہیں مانتے۔ خود انہی بزرگ ائمہ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہمارے لیے ان میں سے کسی کے ساتھ بھی اپنے آپ کو باندھ دینا جائز نہیں ہے۔ بلکہ اصل شے کتابتِ سنت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنا ہے جس کا دین میں مطالبہ کیا گیا ہے۔ ہمیں انھوں نے تنقید سے روکا نہیں ہے بلکہ تنقید کی دعوت دی ہے۔ انھوں نے ہم سے خود یہ مطالبہ کیا ہے کہ ہم ان کے اجتہادات و اقوال کو اصل کسوٹی پر جانچیں، پرکھیں اور جس کے اجتہاد کو کتابتِ سنت سے قریب تر پائیں، اس کو اختیار کریں۔ کتابتِ سنت سے قریب تر کی تلاش میں اہل علم کا غلطی کر جانا اس صواب سے بہتر ہے جو محض تقلیدِ جامد کا نتیجہ ہو۔

ہمیں اس ملک میں ایسے لوگوں سے سابقہ ہے جن کے ذہنوں کو کوئی تعلیم نے مسموم کر رکھا ہے یہ لوگ دین کی بر بات میں مین میخ نکالنے کے عادی ہیں اور ان کی کوشش یہ رہتی ہے کہ وہ وضعی قوانین کے مقابل میں اسلامی قوانین کو خود تراشیت کریں اور نئی نسلوں کو اس سے بے گمان کریں۔ ان سے کامیاب کے ساتھ عہدہ برآ ہونا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک دو باتیں پورے اہتمام کے ساتھ پیش نظر نہ رکھی جائیں۔ ایک یہ کہ اختیار کرنے کی چیز اسلام اور اسلامی فقہ بحیثیت مجموعی ہے نہ کہ کوئی ایک متعین فقہ۔ اسلامی فقہ بحیثیت مجموعی تو بلاشبہ ایک ایسی گراں مایہ چیز ہے جس کی برتری دنیا کے تمام وضعی قوانین کے مقابل میں ثابت کی جاسکتی ہے اور سٹ دھروٹ کے سوا کوئی اس کی مخالفت کی حرات نہیں کر سکتا لیکن اگر کسی ایک ہی متعین فقہ پر اسلامی

قانون کے اجراء و نفاذ کو منحصر کر دیا گیا اور اس پر ضد کی گئی تو اس کے خلاف مخالفوں کو کہنے کا بہت کچھ مواد ملے گا اور یہ چیز اسلامی قوانین کے نفاذ کی راہ میں بڑی رکاوٹیں پیدا کرے گی۔ دوسری یہ کہ موجودہ زمانہ کے ذہن کو مجرد یہ چیز اپنی نہیں کر سکتی کہ فلاں چیز فضا کی فلاں کتاب میں لکھی ہوئی ہے بلکہ لوگوں کو قائل اور مطمئن کرنے کے لیے ایک طرف تو ہر بات کے وہ دلائل دینے ہوں گے جو اصل کتاب سنت سے نکلے ہیں اور دوسری طرف وضعی قوانین کے مقابل میں اسلامی قانون کی عقلی اور اجتماعی حکمتیں اور مصلحتیں بھی واضح کرنی ہوں گی۔ ان دونوں باتوں کے بغیر اسلامی قانون کی برتری کا لوگوں کو قائل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ یہاں قانون کو قائل کرنا نہیں ہے بلکہ قسمتی سے صورت حال کچھ ایسی بن گئی ہے کہ شکایوں اور منکروں کو از سر نو اسلامی قانون کی خوبیوں کا قائل کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے ظاہر ہے کہ حامیان دین کو مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے اور مختلف مکاتب فکر کے علم برداروں کی حیثیت سے میدان میں نہیں آنا ہے بلکہ اس طرح آنا ہے جس طرح ایک ٹیم ایک مشترک مقصد ملین مختلف ذمہ داریوں کو سنبھالے ہوئے میدان میں اترتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ اپنے الگ الگ تشخصات و امتیازات بیک فلم بھول جائیں۔ اگر آپ ان کو باقی رکھنا ہی چاہتے ہیں تو باقی رکھیے لیکن ان کو اپنے اپنے دائروں کی تک محدود رکھیے جس نشان سے ملکی اور اجتماعی قوانین کی حد شرع ہوتی ہے وہاں سے آپ اسلام کے تحت ہر بات کو ماننے اور ہر بات کو چھوڑنے کے لیے تیار رہے اور اپنے اپنے مخصوص فقہی نقطہ ہائے نظر پر اصرار کرنے کے بجائے ہر اس نقطہ نظر کا خیر مقدم کیجیے جو کتاب سنت سے موافقت اور مصالح و حالات سے مطابقت رکھنے والا نظر آئے۔

پچھلی چند صدیوں میں ہماری بعض مسلمان حکومتوں میں اسلامی قانون کو مدون کرنے کی جو

کوششیں کی گئی ہیں ان کو وہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی جو حاصل ہونی چاہیے تھی۔ اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ عموماً قانون کے مدون کرنے والوں نے پوری اسلامی فقہ کو اپنا ماخذ بنانے کے بجائے کسی ایک ہی فقہ کو اپنا ماخذ بنایا۔ اس پابندی کی وجہ سے وہ کوئی معیاری چیز سامنے نہ لاسکے اور بہت جلد اس کی خامیاں محسوس کی جانے لگیں چنانچہ اپنی تجربات کی وجہ سے دوسرے ماضی قریب میں کسی ایک ہی متین فقہ کو اساس بنانے کے بجائے یہ رجحان غالب رہا ہے کہ پوری فقہ اسلامی کو اساس کار بنایا جائے۔ میں نے ان تمام رجحانات کی تفصیل اپنی کتاب اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل میں پیش کی ہے۔ یہاں میں صرف اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں ابتدائی سے ایک وسیع ذراویہ نگاہ کے تحت اس کام کا آغاز کرنا چاہیے۔ نہ قدیم تفصیلات کو ہی راہ میں رکاوٹ بنے دنیا چاہیے اور نہ جدید تفصیلات کو ابھرنے کا موقعہ دینا چاہیے۔

ارباب اقتدار کی خدمت میں ارباب اقتدار کی خدمت میں ہماری گزارش یہ ہے کہ جو مقاصد قطعی اور دھڑکی ذرائع سے حاصل کیے جاسکتے ہیں ان کے لیے خواہ مخواہ کو قانون کا لٹھ نہ گھمایا جائے۔ قانون سے پابندیوں میں اضافے کے بجائے ہر بات میں ملین ہی کے بل پر لوگوں کو کسی چیز کا قائل اور معتقد نہیں بنایا جاتا۔ کسی قوم کے تہذیب تمدن میں اصل رنگ انہی چیزوں کا ابھرتا ہے جو تعلیم و دعوت کی راہ سے اس کی دل و دماغ میں سرایت کرتی ہیں۔ ہمارے پاس نشر و اشاعت کی وسیع ذرائع ہیں وہ رات دن مزرعرات کی اشاعت کر رہے ہیں اگر ہم ان کو ان چیزوں کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنائیں جن سے ہمارے ملک کے عوام بے خبری و توہمت کی بے ضرورت قانون سازی سے ہم مستغنی ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ کڑا ج و طلاق وغیرہ کے واقعات متعلق ضروری تفصیلات کے ریکارڈ لوگ محفوظ رکھیں یا کم سن کی شادیاں رکی جائیں تو یہ ضروری نہیں کہ ان کے لیے لازماً قوانین بنائے جائیں بلکہ پابندیوں اور پابند کرنے کی کوششیں کی جائیں بلکہ

پر دیکھتے اور تعلیم کے ذریعہ سے ان چیزوں کی فوائد مختلف طریقوں کے ذریعہ نشین کرانے چاہئیں یہاں تک کہ ان چیزوں کا اہتمام سوائی کے مزاج میں داخل ہو جائے۔ قانون کی ضرورت تو اس وقت پیش آتی ہے جب ایک برائی کا استحصال تعلیم و دعوت سے ناممکن ہو اور اس سے لوگوں کے حقوق تلف ہو رہے ہوں۔ اگر معیاری نیک ناس چھپے ہوئے لوگوں کو باسانی دستیاب نہ ہوں اور لوگوں میں ان کی اہمیت اور افادیت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد ہمارے معاشرہ میں اس کا عام رواج نہ ہو جائے۔

کمیشن نے جن امور کے بارے میں سفارشات پیش کی ہیں ان میں تین مسئلے ایسے ہیں جن کے بعض پہلو دفعتی قابل توجہ ہیں۔ ایک طلاق ثلاثہ کا مسئلہ ہے۔ دوسرا مروجہ تعدد ازدواج کے سبب بعض نا انصافیوں کے ازالہ کا مسئلہ اور تیسرا تباہی کے حقوق کا مسئلہ ان تینوں سے متعلق ایک صحیح قسم کی اسلامی حکومت کی جو ذمہ داریاں ہیں وہ یہاں بیان کئے دیتا ہوں۔ اگر حکومت پاکستان اس روشنی میں ان مسائل پر غور کرے گی تو وہ ان تینوں مسائل کو نہایت خوبی سے حل کر سکتی ہے۔

طلاق ثلاثہ ایک مجلس کی تین طلاقیں کے بارے میں اس امر میں تو اختلاف ہوا ہے کہ یہ بائن ہوتی ہیں یا بائن نہیں ہوتیں۔ جمہور کے نزدیک یہ بائن ہوتی ہیں اور ایک گروہ کے نزدیک صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے لیکن اس امر پر سب متفق ہیں کہ طلاق دینے کا یہ طریقہ مسنون طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک طلاق اور بھونڈا طریقہ ہے جس سے آدمی ان بہت سے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے جو مسنون طریقہ طلاق میں موجود ہیں۔ اس چیز پر نہ صرف تمام اہل سنت متفق ہیں بلکہ جہاں تک مجھے علم ہے شیعہ حضرات بھی اس امر پر متفق ہیں لیکن یہ ایک نہایت افسوسناک حقیقت ہے کہ ہمارے عوام و خواص کی اکثریت اس امر واقعی سے بالکل بے خبر ہے کہ یہ طریقہ کتاب اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ کے خلاف ہے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کا اظہار فرمایا ہے، اس پر حضرت عمرؓ نے بعض لوگوں کو سزا بھی دی ہے اور

اس کے سوا باب ہی کے لیے انھوں نے ایک مجلس میں دی ہوئی طلاقیں کو نافذ کر دیا۔ خواہ وہ کسی شکل میں دی گئی ہو ایک مسئلہ کا یہ پہلو لوگوں کی نگاہوں سے تقریباً اوجھل ہو چکا ہے۔ اب اگر لوگوں کو معلوم ہے تو یہ یہ معلوم ہے کہ طلاق دینے کا عام طریقہ بالخصوص مسنون طریقہ ہی ہے۔ غلطی عام ذہنوں میں اس طرح بچھڑ چکی ہے کہ اگر کسی کو بتائے کہ طلاق دینے کا یہ طریقہ خود احناف کے نزدیک بھی کتاب اللہ کے ساتھ استہزاء کے حکم میں داخل ہے اور ایک صحیح اسلامی حکومت میں اس طرح طلاق دینے والا سزا کا بھی مستوجب ہو سکتا ہے تو وہ شخص حیرت کے منہ تھکنے لگتا ہے۔

لوگوں کی اس عام بے خبری کا سب سے بڑا سبب تو یہ ہے کہ مسلمان ایک مدت کے کسی ایسے نظام کی برکتوں سے محروم ہیں جو ان کو منکر سے روکنے والا اور معروف کا حکم دینے والا ہو، اور اس کی دوسری وجہ ہمارے ضعیف علماء کی اس معاملہ میں عام سہل نگاہی اور بے پرواہی ہے۔ یہ حضرات بے ادبی معاف فرمائیے، اس امر میں اپنی ذمہ داری صرف یہ سمجھتے ہیں کہ اگر طلاق کا اس طرح کا کوئی مسئلہ ان سامنے آجائے تو طلاق واقع ہوگئی۔ کا فتویٰ دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ اس کی کتاب اللہ کے ساتھ استہزاء اور سنت رسول اللہ کی خلاف ورزی کا جو پہلو ہے اس کی روک تھام یا اس کی اصلاح کی کوئی ذمہ داری یہ اپنے اوپر نہیں سمجھتے۔ حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسلک کی جس کے اوپر احناف کا فتویٰ ہے، اصلی روح یہی تھی کہ لوگوں کو کتاب اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ طلاق کا پابند بنایا جائے نہ کہ صرف طلاق واقع کر دی جائے۔ اگر ہمارے ضعیف علماء نے اپنی اصلی ذمہ داری محسوس کی ہوتی اور وہ اپنی کتابوں، اپنی تقریروں اور اپنے فتوؤں میں برابر اس حقیقت کو لوگوں کے سامنے واضح کرتے رہتے کہ اس طرح اگرچہ طلاق واقع تو ہو جاتی ہے لیکن یہ طریقہ قرآن اور حدیث کے خلاف ہے، اس سے آدمی خدا کی بخشی ہوئی سہولتوں سے محروم ہو جاتا ہے اور گنہگار بھی ہوتا ہے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ طلاق کے مسنون طریقہ کے بجائے ایک علوانہ طریقہ لوگوں میں اس طرح

رواج پکڑ جانا کہ لوگ اس طریقہ کو سنون طریقہ سمجھنے لگ جاتے۔

اب اگر حکومت اس غلط طریقہ طلاق کی اصلاح کرنا چاہتی ہے تو اس کا راستہ یہ نہیں ہے کہ وہ جمہور کے متفقہ مسلا کے خلاف ایک قانون بنا کر رکھ دے۔ بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو مسئلہ کی صحیح صورت کی اچھی طرح آگاہ کیا جائے۔ اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں مثلاً ملک کے تمام مستند بالخصوص حضرات علماء سے ریڈیو پر صحیح طریقہ طلاق پر تقریریں کرائی جائیں، جن میں غلطی طلاق کی ضرباں واضح کی جائیں اور سنون طریقہ کی حکمتیں بیان کی جائیں نیز اس امر کو اچھی طرح واضح کیا جائے کہ ایک شخص میں تین طلاقیں دے دینے سے آدمی گناہگار ہوتا ہے اس موضوع پر کتابیں اور پمفلٹ بھی شائع کیے جائیں اور عام پبلک اجتماعات اور جمعیہ کی تقریروں میں بھی لوگوں کو اس سے باخبر کرنے کی کوشش کی جائے چونکہ یہ ایک متفقہ مسئلہ بات ہے اس وجہ سے توقع ہے کہ بہت جلد لوگوں کے ذہن نشین ہو جائے گی لیکن اگر اس کے بعد بھی یہ رجحان کم نہ ہو تو پھر قانون میں اس طرح طلاق دینے والے کے لیے کوئی سزا بھی رکھی جاسکتی ہے۔

تعدد ازدواج | تعدد ازدواج کے مسئلہ میں جو چیز قابل اصلاح ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگ ایک بیوی کے سوتے ہوئے دوسری شادی تو رہا دیتے ہیں کہ اسلام نے اس کی اجازت دی ہے لیکن اس اجازت کے ساتھ عدل کی جو شرط لگی ہوئی ہے وہ ان کو یاد نہیں رہتی اور وہ پہلی بیوی کو یا دونوں میں سے کسی ایک کو بالکل معلقہ بنا کر رکھ چھوڑتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس قسم ناک صورت حال کے پائے جانے کے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں وہ بڑے سبب ہیں۔ ایک یہ کہ عدل ترک اندر اپنے حقوق کا صحیح احساسی موجود نہیں ہے۔ وہ زندگی بھر ایک معلقہ کی حیثیت سے زندگی گزار دیتی ہیں لیکن اس صورت حال کی اصلاح کے لیے ان کے اندر کوئی ہمت نہیں پیدا ہوتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر ان کے اندر اپنے حقوق کا کوئی احساس پیدا ہو بھی اور وہ ان کو حاصل کرنا چاہیں بھی تو ان کے

حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ایسا موجود نہیں ہے جس سے وہ امتداد کر سکیں۔ ہمارا موجودہ عدالتی نظام اتنا مضبوط اور اتنا پیچیدہ ہے کہ اس سے انصاف حاصل کرنا کمزوروں اور غریبوں کے لیے تو ناممکن ہے۔ ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے تین طریقے آسانی کے ساتھ اختیار کیے جاسکتے ہیں۔

ایک یہ کہ ملک کے عام اصلاحی ادارے خصوصاً خواتین کی انجمنیں عورتوں کے اندر ان کے حقوق کا احساس پیدا کریں۔ تقریروں، تحریروں نیز انفرادی و اجتماعی ملاقاتوں کے ذریعہ سے دیہاتوں تک کی خواتین کو یہ اچھی طرح بتایا جائے کہ اسلام نے ان کو کیا حقوق بخشے ہیں اور ان کو حاصل کرنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اس معاملہ میں حکومت کے محکمہ نشر و اشاعت کو بھی ان پبلک اداروں اور خواتین کی انجمنوں کی مدد کرنی چاہیے۔

دوسرا یہ کہ ہمارے یہاں بھی وسیع پیمانے پر پنچائتی نظام قائم کیا جائے اور اس کو دیہاتی علاقوں میں خصوصیت کے ساتھ پوری وسعت دی جائے۔ اس پنچائتی نظام کو جہاں دوسرے اصلاحی کاموں کا ذریعہ بنایا جائے وہاں اس کو اس طرح کی گھرنیوں یا انصافیوں کو دور کرنے کا بھی واسطہ بنایا جائے اور اس کے لیے ایک خاص حد تک ان پنچائیوں کو اختیارات بھی دیئے جائیں۔

تیسرا یہ کہ اس طرح کی تمام نزاعات کا فیصلہ کرنے کے لیے شادی بیاہ کی اس قسم کی عدالتیں قائم کی جائیں جس طرح کی عدالتیں کمیشن نے تجویز کی ہیں۔

اگر یہ تینوں طریقے اختیار کر لیے جائیں تو ہمیں امید ہے کہ نہ صرف وہ نا انصافیاں دور ہو جائیں گی جو تعدد ازدواج کی اجازت کے سوا استعمال سے ہمارے معاشرے کے اندر پائی جاتی ہیں بلکہ اگر ہمارے معاشرہ کے کسی طبقہ میں غلط اور غیر ضروری قسم کا تعدد ازدواج پایا جاتا ہے تو وہ بھی بالذریعہ ختم ہو جائے گا۔

یتیموں کا مسئلہ | یتیموں کا مسئلہ صرف اسی ایک پہلو سے غور کرنے کا نہیں ہے کہ بعض یتیم اپنے دادا کی

جائداد میں سے حصہ نہیں پاتے۔ یہ شکل تو کہیں ہزاروں یموں میں سے دو چار کو پیش آتی ہے اور عموماً اچھے گھرانوں میں آپ کے آپ اس کا حل بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اتنی عمر میں اب تک میرے سامنے پوتے کی محمودی کے جتنے واقعات پیش آئے ہیں میں نے یہ دیکھا ہے کہ دادا اور چچا کی محبت و شفقت سے یہ مسئلہ نہایت خوبی سے خود حل ہو گیا ہے۔ اگر بالفرض نہیں بھی حل ہوا ہے تو دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ہمارے ملک کے لاکھوں یموں میں سے کتنے یموں کا مسئلہ ہے۔ اگر آپ اسلام کے سامنے ضابطہ وراثت کو توڑنا ذکر اس کو اپنے خیال کے مطابق حل بھی کر دیا تو اس سے کتنے فی صد یموں کی مشکل حل ہوگی۔ ملک کے یموں میں ہزاروں لاکھوں یم تو ایسے ہیں جن کا واحد سہارا ان کے باپ کا سایہ ہی تھا۔ اس کے اٹھ جانے کے بعد خدا کے سوا ان کا کھل سہارا باقی نہیں رہا۔ نہ دولت بھرز میں ہے نہ زندگی بسر کرنے کا کوئی اور ذریعہ۔ اس وجہ سے اسلام نے یموں کے مسئلہ پر انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ اجتماعی حیثیت سے نگاہ ڈالی ہے اور اس کو اس طرح حل کیا ہے جس سے ہر یم مسئلہ حل ہو کر صرف ان چند یموں کا جو اپنے دادا کی جائداد میں حصہ پانے سے محروم ہو گئے ہوں۔

اسلام نے افراد، معاشرہ اور ریاست تینوں پر یموں سے متعلق نہایت اہم ذمہ داریاں ڈالی ہیں۔ اسلام کے نقطہ نظر سے کوئی فرد ایک سچا مسلمان نہیں، کوئی معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ نہیں اور کوئی ریاست ایک صحیح اسلامی ریاست نہیں جب تک یہ درجہ بدرجہ یموں سے متعلق اپنے فرائض ادا نہ کر دیں۔

اسلام نے الگ الگ افراد سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنے اپنے کنبہ اور خاندان کے یموں کے ذمہ دار بنیں۔ شخص پر اس کے قریبی رشتہ داروں کے بعد دوسرے ہی کنبہ اس خاندان کے یموں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اگر یم کی کوئی جائداد ہے تو اس کی دیکھ بھال اس کے ولی کے ذمہ ہے اور یہ ذمہ داری ولی کو، حتیٰ الامکان بغیر کسی اجرت اور معاوضہ کے اٹھانی چاہیے۔ اور ہرگز اس جائداد میں کوئی ایسا تصرف نہیں کرنا چاہیے جس سے اس کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ اور اگر یم کی کوئی جائداد نہیں ہے تو اپنے اولیاء و اقربا کے تمام احسانات و تبرعات کا سب سے اول حقدار یہ یم ہے نہ کہ کوئی دوسرا۔

معاشرہ پر یہ ذمہ داری ہے کہ اس کے تمام مال دار افراد کے مال میں اسلام نے ایک حصہ مقرر کر دیا ہے جو سب کا سب صرف مغربوں اور یموں ہی کا حق ہے اور یہ مال نصاب کی آمدنیوں میں سے وصول بھی ایک حق ہی کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ اگر دینے والے زدن و حکومت قانون کے زور سے ان سے وصول کر سکتی۔

ریاست پر یہ ذمہ داری ہے کہ اس کی جو خاص آمدنیاں ہیں ان میں بھی یموں کو شریک کر دیا گیا ہے تاکہ ریاست اپنی ترقیاتی اسکیموں میں سے کبھی اسکیم میں بھی یموں کی فلاح و بہبود کے نصب العین سے بے پروا نہ ہو سکے۔ یموں کے اسی حق غالب کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پورے بیت المال کو یموں کا مال کہتے تھے اور اس میں سے اپنے کفالت سے نامہ لینے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

بہر حال جہاں تک ایک صحیح اسلامی ریاست کا تعلق ہے اس میں یہ سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے کہ ایک یم نے اپنے دادا کی جائداد میں سے حصہ پایا نہیں۔ حکومت اس کا وجہ دادا پر ڈالنے کی بجائے خود خدائی ہے اور اس کو اس قابل بنادیتی ہے کہ وہ آئندہ اپنی ذمہ داریاں خود اٹھا سکے۔ جو لوگ محض اس چیز کے سبب اسلام کے قانون وراثت پر حرف گیری کرتے ہیں وہ اسلام کے نظام کی اس حقیقت سے بالکل ہی بے خبر ہیں کہ اس میں سب سے بڑا حق یم ہی کا ہے۔ اس ملک میں بھی اگر یموں کا مسئلہ صحیح طور پر حل کرنا ہے تو اسی طریقہ پر حل کیجئے جس طریقہ پر اس کو اسلام نے حل کیا ہے۔ یہ کوئی انصاف کی بات نہیں ہے کہ یم کے سامنے حقوق تو آپ کے حفظ نظام کے پیٹ میں ہوں اور آپ اسلام کو گایاں دیتے پھریں کہ اس نے دادا کی جائداد میں سے پوتے کو وراثت کیوں نہ دلائی۔

خواتین کی خدمت میں | اب میں آخر میں دو ضروری باتیں بیان مسلمان بہنوں کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں جو اس ملک کی مسلمان خواتین کی رہ نمائی کرنا چاہتی ہیں۔

ان کی خدمت میں پہلی گزارش یہ ہے کہ یہ بھی اس امر میں ایک سو مرتبہ جائیں کہ انہیں مغربی عورتوں کی مثال

کرتی ہے تو وہ اللہ اپنے حق شوق کے نیچے اسلام کو کائناتوں میں نہ گھسیٹیں۔ اس مقصد کے لیے انھیں اسلام کا نام استعمال کرنے کے بجائے انہی نعروں کے ساتھ میدان میں آنا چاہیے جن نعروں کے ساتھ ان کی مغربی بہنیں اس میدان میں آئی ہیں اور صاف صاف کہنا چاہیے کہ ہمیں اسلام نہیں چلے انہی منوں میں آزادی اور مساوات چاہیے جن معنوں میں ہماری مغربی بہنوں کو آزادی اور مساوات حاصل ہے۔

اور اگر وہ ان حقوق کی طالب ہیں جو اسلام نے ان کو بخشے ہیں تو ان کا یہ مطالبہ سرانگھوں پر، اسی کھلے پرستان اس مطالبہ میں ان کے ساتھ ہے۔ وہ شوق سے اپنا ایک ایک حق وصول کریں اور قانون کے زور سے حاصل کریں۔ یہ حکومت اگر ان کے یہ سارے حقوق ان کو نہ دلوں گی تو یہ ایک اسلامی حکومت کہلانے کی مسکن نہیں ہو سکتی۔ اگر اس ملک کا سماجی اتفاق اسلام کے خطوط پر ہوا تو یہ چیز ان کو ہمالیہ آپے آپ حاصل ہوگی۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ آپ کے جذبات سے زیادہ براہ کجیہ تعداد ازدواج کے خلاف ہیں لیکن

آپ صرف اسی تعداد ازدواج کے خلاف کیوں ہیں جس کی مثال کہیں اکا دکا آپ کے معاشرے میں ملتی ہے؟ اُس تعداد ازدواج کے خلاف آپ کی غیرت نسوانی جو جس میں کہیں نہیں آتی جس کی مثالیں نئی تندی کی بدلت آپ کے پر محفل، سرد عورت، سرد ذہن، ہر کچھ، ہر غلط کالچ اور سرد فخر میں مل سکتی ہیں اور اگر سنیاں نمائش کمبوں اور عیاشی کے دوسرے اڈوں کا بھی اسی فہرست میں اضافہ کر لیجئے تب تو پھر کوئی حد ہی اسی کی باقی نہیں رہ جاتی۔ آخر جو بہنیں ایک سو گئی کے تصور سے بچ چیں یہیں ہوتی ہیں وہ اسی پیم پر کیوں نہیں غور کرتیں کہ مغربی تہذیب نے عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط کی جو راہ کھولی ہے اس کی بدلت آج مغربیہ سوسائٹی کی شاہد کی کوئی ایسی خوش قسمت عورت ہر گرج کے شوہر کے دل اور مال دونوں میں ان گنت سکونیں شریک نہ ہوں۔